راجہ انور

ہمالہ کے اُس پار

عوامی جمہوریہ چین اور کوریا کا ایک دلچسپ اور فکر انگیز سفر

JALALI BOOKS

ہمالے سے اُس پار

JALALI BOOKS

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

راجہ انور

ہمالہ کے اس پار

KUTUB
JALALI BOOKS
JALALI

کلاسیک ۰ لاہور

ناشر : آغا امیر حسین
کلاسیک ۴۲ شاہراہ قائداعظم لاہور
فون :- ۶۱۸۳۰
طابع : اللہ والا پرنٹرز ـــــ لاہور
باراوّل : ایکہزار ● ۱۹۷۸ء

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

جیل کی تنہائیوں میں

مقید بُھٹّو کے نام

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب چین اور کوریا سے متعلق ایک تعارفی سا کتابچہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کتاب کسی بھی لحاظ سے مکمل اور جامع کہلانے کی مستحق ہے۔ چین اور کوریا موجودہ صدی کی تاریخ کا بہت بڑا انقلابی تجربہ ہیں۔ وہ انقلاب کا نیا باب اور نویلی داستان ہیں۔ اُن کی ہمہ گیری اور وسعت کا احاطہ کرنے کے لیے کسی ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ بلکہ ان ممالک کی سماجی زندگی کے ہر پہلو پر ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ تاہم اگر زیرِ نظر کتاب پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن میں ایک عمومی سا خاکہ اُبھرتا ہے۔ ان ممالک کی زندگی پر کوئی نکتہ نظر ملتا ہے، تو میں سمجھوں گا یہ کوشش ناکام نہیں رہی۔

یہ کتاب ایک طرح سے سفرنامہ بھی ہے۔ یہ سفر مجھے جناب بھٹو کی رفاقت میں کرنے کا موقعہ ملا۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی ادبی قسم کا سفرنامہ ہے۔ ہمارے محترم بزرگ انشا جی ملک بہ ملک کوچ کرتے پھر رہے ہیں۔ لہذا، اُن کے سفرنامے، آدھی سے زیادہ دُنیا کا حسین نقشہ ہیں۔ اُن سے کوئی ملک بمشکل ہی بچا ہوگا۔ لہذا، ان کے پائے کی چیز لکھنے کے لیے ابنِ انشا ہونا

لازم ہے۔ اور میں ابنِ انشا نہیں ہوں۔ لہذا، میری کتاب کا موازنہ ان کے متنوع سفرناموں سے نہ کیجیے۔

اس سفرنامے کا مسودہ ایک زمانے سے تیار تھا۔ جب کبھی لاہور آنا نصیب ہوتا۔ کلاسیک والے آغا جی فرماتے "مسودہ دے جاؤ۔ تاکہ کتاب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا جائے"۔ پر میں اس انتظار میں تھا کہ کب آغا جی کی کلاسیک کو دوسری بار آگ لگتی ہے۔ سو ہمارے "مجاہدین" نے آگ لگا دی۔ اچھی اچھی کتابیں جل کر تباہ ہوگئیں۔ علم کے خزینے دھواں اور راکھ بنے۔ اب میدان خالی ہے۔ ہم سے لوگوں کی یہ کتاب اُن کی دکان پہ سجے گی۔ اچھے اور بُرے کا مقابلہ نہ رہے گا، تو خوب بکے گی۔

پر اس درمیانی عرصے میں صرف آغا صاحب کی دکان ہی نہ جلی، ملک میں تیسری بار مارشل لاء کا نفاذ بھی ہوا۔ ایک دُنیا اجڑ گئی، ایک آباد ہوئی۔ وہ لوگ جو اس چمن کا حسن تھے۔ انھیں دیکھنے کو ترستے ہیں۔ اور جانے کب تک ترستے رہیں گے۔

ہمارے درمیانے طبقے کی ریت ہے کہ جب کوئی برسرِ اقتدار ہو، تو ہم اس کی ستائش میں زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں۔ مگر جب زوال کی ہوا چلے، تو ہم اس شخص کو دُنیا کا بد ترین فرد قرار دینے سے نہیں چوکتے۔ یہ بدترین قسم کی موقعہ پرستی ہے۔ میں اُجڈ، گنوار، دیہاتی ہوں، سوشلزم پہ یقین رکھتا ہوں، بھٹو کے ساتھ تھا، اور رہوں گا۔ کیونکہ دوستوں کو بُرے وقت میں چھوڑنا، دنیا کے کسی عقیدے میں جائز نہیں۔ لہذا آج جب ساری دُنیا، بھٹو کو گالی دینا اپنا فرض جانتی ہے۔ میں یہ کتاب اپنے اس عظیم لیڈر کے نام منسوب کرتا ہوں۔

میرے انقلابی ساتھی شوکت علی نے اس کتاب کی تیاری میں میرا ہاتھ بٹایا۔ کئی کئی بار مسودے کو پڑھا۔ میں ان کا انتہائی ممنون اور شکر گزار ہوں۔

میرے بزرگ دوست پروفیسر عبدالقادر راجہ نے مجھے یہ کتاب لکھنے پر اکسایا۔ ان کی بات میں ہمیشہ پلّے باندھتا ہوں۔ پس کتاب آپ کے سامنے ہے۔ اگر آپ کے معیار پہ

پوری اُترے تو مجھے مبارک دیں، اگر پسند نہ آئے تو راجہ صاحب کو کوسنے دیں۔ وہ جانتے ہیں اگر برخوردار پاس ہو جائے تو ماں بلائیں لیتی ہے اور محلے بھر میں بتاتی پھرتی ہے "دیکھو میرا بیٹا کتنا لائق نکلا" لیکن عزیزی اگر گھٹنا ٹیک جائیں پھر بےچارے اُستاد ہی کی شامت آیا کرتی ہے۔ راجہ صاحب پرانے اُستاد ہیں۔ تعریف کی بجائے کوسنے سُننے کے عادی ہیں۔ لہٰذا بُرا نہ مانیں گے۔

انور راجہ

معرفت ۱۸۹ دھیال روڈ۔ راولپنڈی

KITAB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

یہ ۱۹ مئی ۱۹۷۶ء کی خوشگوار صبح تھی۔ ہلکے ہلکے بادل، تیز ہوا کا زور اور کبھی کبھار آسمان کی کوکھ سے ٹپکتی بوندیں۔ کراچی ایئرپورٹ پر انسانی سروں کا موجیں مارتا سمندر تھا۔ دُنیا اس کاروانِ شوق کو وداع کہنے آئی تھی، جو وزیر اعظم بھٹو کی قیادت میں ہانگ کانگ، چین اور کوریا کے دورے پر روانہ ہونے کو تھا۔ ایئرپورٹ کی فضا پاک چین دوستی کے نعروں سے مُترنم تھی۔ یار لوگ بس ایک ہی فرمائش دُہرائے جا رہے تھے۔ "چین سے ماؤ کیپ لانا۔ مت بھولنا۔" فرمائشیں جس حساب سے داغی جا رہی تھیں، یُوں لگتا تھا، جیسے مطلوبہ مال کے لیے کوئی بحری جہاز بُک کرانا پڑے گا۔ تاہم — ہر بار اقرار میں سر ہلا کر کہا "ماؤ کیپ بھی لاؤں گا، اور دریائے یانگ سی کا پانی بھی۔ اور اگر وہاں کہیں کھجور ایسا بہشتی میوہ میسر آیا، وہ بھی سیر دو سیر لیتا آؤں گا۔ گھبراتے کاہے کو ہو میرے یارو۔ بس اِک ذرا، وہاں تک پہنچ تو جانے دو۔"

کوئی ساڑھے نو بجے کا عمل ہو گا کہ جہاز نے فضا میں انگڑائی لی۔ ہماری پہلی منزل ہانگ کانگ تھی۔ یہاں ایک دو دِن رُک کر ہم نے کوریا جانا تھا، اور وہاں سے چین۔ گویا کہ اصل داستان تو چین و کوریا تھے۔ ہانگ کانگ محض زیبِ داستان کے طور پر اس دورے کا حِصّہ تھا۔ ہانگ کانگ کی شہرت اور چرچے ہر زبان پر تھے۔ یارانِ نکتہ رس، اس مہم پر خوش تھے کہ "ہانگ کانگ" بائی نائٹ کے فسانے اگر محض فسانے ہی نکلے۔ تو بھی کم از کم

ہانگ کانگ کے نلکوں کا پانی ہی پی آئیں گے۔ اور یُوں لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہو پائیں گے۔

جہاز کے اندر پُوری ایک دُنیا آباد ہے۔ ایک جانب صحافی حضرات کی محفل جمی ہے۔ جہاں تبصرے ہیں، تنقید ہے اور ہر بات کُتر بیونت کے بیلنے سے گُزر کر باہر آتی ہے۔ دُوسری جانب سرکاری افسروں کا ٹولہ ہے کہ جس کا جتنا رتبہ بلند، اتنی ہی گردن بلند، بلکہ اس سے بھی دو چند۔ ایک کونے میں مسعود محمود المعروف بہ ایف ایس ایف والے براجمان ہیں۔ ہاتھ میں سگار ہے۔ اپنی پُوری کوشش سے "بھٹو سٹائل" میں سگار پینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس قدر اکڑ کر بیٹھے ہیں، کہ کورا لٹھا بھی مائع اور کلف کھانے کے بعد کیا اکڑتا ہوگا! جہاز کے اندر بھی موصوف سیاہ چشمہ پہنے، سر پہ ہیٹ جمائے "جیمز بانڈ" کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے! افضل سعید بھی بیٹھے ہیں۔ وزیر اعظم کے سیکرٹری ہیں۔ ان کا شمار بھی "پہنچے ہُوئے" لوگوں میں ہوتا ہے۔ تاہم سادگی پسند ہیں، اور خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، لہٰذا "افسرانہ بدماغی" سے پاک ہیں۔ سدا کی مانند، سکڑے، سمٹے اور سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ان کے ساتھ ایف آئی اے کے ڈائرکٹر براجمان ہیں۔ عینک کے بوجھ سے، ناک اپنے محور سے ذرا ہٹ چکا ہے۔ مگر یُوں مُنہ بھینچ کر بیٹھے ہیں، جیسے ـــ دُنیا کی سب سے نایاب شئے اُن کی مسکراہٹ ہو۔ تیسری جانب سیاست دان حضرات کی بزم جمی ہے۔ جہاں ہر کوئی مزاجِ یار سے قُربت کا دعویدار ـــ قائد کا جاں نثار اور سیاست کا بحرِ بے کنار، بنا بیٹھا ہے۔ اس محفل میں مرکزی وزیر سید ناصر رضوی بھی موجود ہیں۔ اور پُورے جوش اور ولولے سے "اپنی وفاداریوں" کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ یہیں تاج محمد لنگاہ بھی بیٹھے ہیں۔ دونوں حضرات ایک ہی علاقے سے متعلق ہیں ـــ مگر ہمہ وقت ایک دُوسرے پر تنقید کے تیر برساتے ہیں۔ چنانچہ جہاز میں بھی یہ حملے جاری رہے۔ لنگاہ پُوری شدت کے ساتھ اپنی دلیل کا ہتھیار آزماتے ہیں، اور ناصر رضوی ان سے بھی دو قدم

دُور سے پلٹ کر حملہ آور ہوتے ہیں۔

مرکزی وُزرا میں سے شیخ رشید اور حفیظ پیرزادہ بھی موجود ہیں۔ صُوبائی وزرا میں سے ڈاکٹر عبدالخالق (پنجاب) عبدالرزاق خان (سرحد) تیمور شاہ جوگیزئی (بلوچستان) عبدالوحید کٹپر (سندھ) موجود ہیں۔ جنرل شریف اور ایئر مارشل ذوالفقار علی بھی موجود ہیں۔

میرے ساتھ زاہد حسن خان تشریف فرما ہیں۔ موصوف وزیر اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں اور جناب بھٹو کے ساتھ پچھلے پندرہ بیس برسوں سے کام کر رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ زاہد میاں مردِ قلندر ہیں۔ دل کسی کا نہیں توڑتے۔ جب حسین ایئر ہوسٹس مسکرا کر سلام کہتی ہے، تو مردِ قلندر، از رُوئے ادب و احتیاط، یا برائے عجز و انکسار، جواباً اسی انداز میں مسکراتے ہیں بلکہ کورنش بجا لاتے ہیں۔ وہ پُوچھتی ہے: "کون سا ڈرنک سر؟" زاہد میاں شرما کر اِدھر اُدھر جھانکتے ہیں کہ باقی دُنیا کے کیا رنگ ہیں؟ یار لوگ کس کروٹ بیٹھے ہیں؟ مگر بُرا ہو نظر کا کہ بہت کم پائی ہے۔ لہٰذا پُوری تانکا جھانکی کے باوجود کچھ پتہ نہیں چلا پاتے۔ مجھے کُہنی سے ٹہوکا دیتے ہیں، یعنی تم ہی بتاؤ۔ عرض کرتا ہوں، "حضرت، حوصلہ پکڑیے۔ آگے بڑھیے۔ اتنا بھی شرمانا کیا؟" ——— زاہد حسن کھانسنے کے طویل پروگرام سے فارغ ہونے کے بعد کہتے ہیں "ایں! یعنی، جانی واکر، ہی لے آئیے" ——— ہوسٹس پوچھتی ہے "چھوٹا یا بڑا؟" مردِ قلندر نیم مسکراتے، نیم شرماتے اور نیم کسمساتے ہوئے منمناتے ہیں "یعنی چھوٹا، بڑا کب تک لاتے رہیں گے پُوری بوتل ہی یہیں رکھ جائیے"؛ مُفت کی مے۔ فضا کی بلندیاں ہوں۔ ساقی حسین ہو۔ طبیعت قلندرانہ ہو، تو پھر ہوش کس کافر کو رہے گی۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ بعد نقشہ کچھ یوں ہے کہ ——— بوتل خالی ہے۔ مردِ قلندر کی گردن نے سر کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا ہے۔ حضرت اب اُردو کی بجائے، فرنگی کی زبان بول رہے ہیں۔ ٹائی پھسل کر ایک جانب ہو چکی ہے۔ آنکھیں نیم وا ——— اور دہان شریں ——— اگر ایک بار کھول دیں، تو کئی کئی لمحے اسے بند کرنا بھول جاتے ہیں!

"الفتح" والے ارشاد راؤ، باری باری ہر کسی پہ پھبتی کستے ہیں۔ خود زیادہ ہنستے ہیں۔ تاہم کبھی کبھار دُوسروں کو بھی یہ موقع فراہم کر دیتے ہیں۔ "پاکستان ٹائمز" والے برکی صاحب جو اپنی ڈیل ڈول سے، جرنلسٹ کم اور جرنیل زیادہ نظر آتے ہیں۔ پُورے انہماک کے ساتھ کسی سے بحث میں مصروف ہیں۔ "مشرق" کے عثمانی صاحب ہر کسی سے ایک ہی بات پُوچھے جاتے ہیں۔ "صاحب! جہاز سیلون کا راستہ لے گا یا ہندوستان پر سے گزرے گا؟" اے پی پی والے قریشی صاحب صرف مسکرانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس مہنگائی اور نایابی کے دَور میں مسکرانا بھی بڑی بات ہے! تھوڑی دیر بعد پائلٹ کی آواز گونجی "اب ہم ہندوستان پر ہیں۔ ہماری بلندی ..... رفتار ..... ٹمپریچر .... اتنا ہے۔"

مَیں کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوں لیکن نیچے صحرا سا نظر آتا ہے۔ ہمارے تھرپارکر کی مانند ــــ ریت کا سمندر، حدِ نظر تک پھیلا ہُوا ہے۔ تاہم تھوڑی دیر بعد زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ مچلتے دریا، نہریں، سبزہ اور ہریالی، خُود رُو جھاڑیوں کی طرح پھیلے ہُوئے دیہات اور گندم کے کھلیان ــــ الغرض ناک نقشے سے پاکستان ہی لگتا ہے۔

..... اور پھر میرا شعور جیسے آہستہ آہستہ ماضی کے دُھندلکوں میں تحلیل ہو گیا۔ ان اجنبی فضاؤں میں، بیتے زمانوں کی دبیز تہیں، ایک ایک کر کے میرے سامنے وا ہوتی ہوتی چلی گئیں۔ میرے شعور کے پردوں پر مختلف مناظر اُبھرتے، پھیلتے اور ڈوبتے چلے گئے ..... گھنٹیاں، ناقوس، اور نقارۂ جنگ کی آوازیں۔ تلوار کی جھنکار، مرنے والوں کی آہ و بکا، میدانِ جنگ کا شور و ہنگامہ ..... قیامت کا منظر ہے۔ یہ شورِ محشر ذرا تھمتا ہے ۔۔ تو حملہ آوروں کے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ستواں ناک، کُشادہ سینے اور اُونچے قد۔ مگر آنکھوں سے بربریت اور وحشت جھلکتی ہے، اور ہاتھوں سے خُون ٹپکتا ہے۔ ان کے علم پر عقاب کی تصویر ہے جس کے دو سر ہیں۔ گلے میں مقدس مذہبی نشان لٹک رہا ہے۔ سُورج کے طلوع ہونے کا نشان، جس کی شکل سواستیکا سے

ملتی جلتی ہے۔ سرزمین ہند کے قدیم باسی' جنوبی ہند کی جانب بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر موت یا غلامی کے سوا' جائے پناہ مفقود ہے۔ زندگی پر راہ بند' اور آزادی کا ہر سانس پابند۔ جنگل کا قانون حرکت میں ہے۔ چنانچہ زندگی صرف اس کے ساتھ دو گام چلتی ہے' جس کے بازوؤں میں زیادہ قوت اور ہتھیار میں زیادہ تیزی ہو۔

یوں دیکھتے ہی دیکھتے' درّہ خیبر سے اُمڈ کر آنے والا یہ طوفان' ہر چہار سُو پھیل جاتا ہے۔ یہ آریائی نسل کی ہند میں آمد کا دَور ہے۔

اور پھر صدیوں کا سکُوت!!!

ہند کے اندھیاروں میں ایک پیغمبرانہ آواز اُبھرتی ہے۔ جس کے ارتعاش سے روایات کی زنجیریں پگھل اُٹھتی ہیں۔ ہندمت کے اصنام اس آواز کی صداقت سے لرزاں ہیں۔ دھرتی اس صدا کی بازگشت سے بیدار ہوتی ہے ـــــ یہ آواز بُدھ کی تھی۔ جس نے شاہوں کے ہاں جنم لیا' گداؤں کی زندگی بسر کی' اور کسانوں کی بستی میں نروان کا گیان پایا۔

صدیاں یوں ہی گزرتی ہیں!!!!

اچانک فضا میں چیخ اُٹھتی ہیں۔ درّہ خیبر کا دہانہ ایک بار پھر کھل گیا ہے۔ نئے لشکروں کی یلغار ہے۔ آنے والوں میں پٹھان بھی ہیں' اور تیمور کے وارث بھی۔ رن پہ رن پڑتا ہے۔ زبردست معرکہ آرائی کا سماں ہے۔ ہند کی دھرتی نوواردوں کے قدموں تلے کانپ رہی ہے۔ پھر فتح کے طبل بجتے ہیں ـــ نئے لشکری ہندوستان کی سرزمین پر نئے مذہب' نئی تہذیب اور نئی زبان کا پودا لگاتے ہیں . . . . یہ مسلمانوں کی آمد ہے۔

اور پھر صدیوں بعد!!!

برصغیر ایک بار پھر بم اور بارُود کے دُھوئیں میں غرق ہو چکا ہے۔ بادل ذرا چھٹتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایک دُنیا بدل چکی ہے۔ ٹیپو مردانہ جان پیش کر چکے ہیں۔ مرہٹوں کی

قوت دم توڑ چکی ہے۔ مُغلوں کا تاج تاراج ہے۔ دہلی کا بوڑھا بادشاہ، عشقیہ شاعری کا دیوان بغل میں دبائے پابہ زنجیر ہو چکا ہے۔ حیدر آباد سندھ کے تالپور سرنگوں ہیں۔ شاہ لطیف اور سچل سرمست کا سندھ غلامی کے زہر میں تحلیل ہو چکا ہے۔ یہ سفید زہر پنجاب کی رگوں میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔

شاہ حسین کی کافیوں سے مہکتا دیس، بُلّھے شاہ کی مستیوں کا گہوارہ اور نانک کی صداؤں سے گونجتا پنجاب۔ وہ نانک جس نے ایک بار کہا تھا:

باجھ محمد نانکا تے بیڑا پار نہ ہو۔

پنجاب غلامی کے اندھے کنوئیں میں گر جاتا ہے۔ اور بات جا کر تورخم پر رُکتی ہے۔ آن بان والے بہادر پٹھان غلامی کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ ڈیرہ غازی خان کے تمن دار انگریز کی رکاب تھام کر چلتے ہیں۔ اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر بلوچستان داخل کراتے ہیں۔ سنڈیمن کے زہریلے ڈنک سے عظیم بلوچ بے سُدھ ہو جاتے ہیں۔

یہ انگریز کی آمد کا دور ہے !!!

تاریخ ایک بار پھر انگڑائی لیتی ہے۔ برصغیر کی فضائیں آزادی کے گیتوں سے مُترنم ہیں۔ مُلک کا گوشہ گوشہ بیداری کے نغموں پر رقصاں ہے ..... برصغیر کے دامن پر دو آزاد ملک اُبھرتے ہیں۔ مگر آزادی کی خوشیاں شعلوں میں گھر جاتی ہیں۔ خُون کے دریا بہتے ہیں۔ آگ، گولی، خُون اور قتلِ عام ..... فرقہ وارانہ فسادات کی نفرتیں ..... تھکے ماندے بے حال ..... اور گرتے پڑتے قافلے۔ آزادی کے پرچم تھامے اپنے ہی خون کے دریا عبور کر رہے ہیں ....

یہ ۱۹۴۷ کا زمانہ ہے ....

جناب ہم کلکتے پر پرواز کر رہے ہیں۔ ہماری بلندی ساڑھے گیارہ ہزار میٹر ہے۔ اور رفتار .....!" مائک پر کیپٹن کی آواز گونجتی سنائی دیتی ہے۔ میں ماضی کی دُنیا سے

لوٹ کر حال میں پہنچتا ہوں۔ ہمارے پروں کے عین نیچے فرخا بند ہے۔ لیجیے کلکتے کا شہر آگیا۔ دو تاریخی دریا سنگم بنا کر شہر کے درمیان سے گزرتے ہیں۔ اب ہمارے دائیں ہاتھ ڈم ڈم کا مشہورِ زمانہ ایئرپورٹ ہے جہاں سے کوئی جہاز فضا میں بلند ہو رہا ہے۔ کلکتہ، دریا کے دونوں جانب مبالغے کی حد تک پھیلا ہوا ہے۔ دریا کے اوپر ایک پل دکھائی دیتا ہے جو شہر کے دونوں حصوں کو جوڑتا ہوگا۔ خاصا بڑا پل ہے کہ ٢٥ ہزار فیٹ کی بلندی سے بھی بخوبی نظر آرہا ہے۔ اس شہر کی اصلی شکل و صورت تو جانے کیا ہوگی۔ تاہم اپنی کراچی سے کہیں زیادہ پھیلا ہوا بھی نظر آیا اور پھولا ہوا بھی۔ جبھی تو بارہ لاکھ سے بھی زیادہ غریب اس شہر کے فٹ پاتھوں پر سو کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

اسی شہر میں فورٹ ولیم کالج بنا تھا۔ برصغیر کی تاریخ کا پہلا کالج جہاں "بابا" لوگ اردو پڑھتے تھے۔ تاکہ ہم "جنگلیوں" پر حکومت کرنے میں انھیں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اسی شہر کے متعلق ١٩٧١ء میں جماعت اسلامی والے پروفیسر غلام اعظم نے کہا تھا "اگر جنگ ہوئی تو ہم عید کی نماز کلکتے میں پڑھیں گے..... یہی وہ شہر خرابی ہے جہاں بنگلہ دیش کی جلا وطن حکومت بنی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پاکستان پر شب خون مارنے کا صدر دفتر قائم تھا.....

جہاز ذرا سا دائیں جانب رخ کرتا ہے۔ اب ہم خلیج بنگال پر ہیں۔ ہاں وہی خلیج بنگال، جو کبھی طوفان کی آماجگاہ تھی۔ ہماری بائیں جانب وہ سرزمین تھی جسے کبھی پاکستان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہیں سراج الدولہ نے سامراج کے خلاف پہلی جنگ لڑی تھی۔ تیتو میر نے یہیں آزادی کا چراغ جلایا تھا۔

یہیں سے وہ قافلہ چلا جس کی پہلی منزل پاکستان ٹھہری..... پھر یہیں سے شورِ محشر اٹھا۔ حسین چہروں سے نفرت کے زہر ابلنے لگے۔ سنہری مٹی خون میں نہا گئی اور ملک دو لخت ہو گیا..... آج دونوں جانب پچھتا رہے ہیں۔ لیکن اب کیا ہوت!

بنگال نظر آتے —— اور بھاشانی یاد نہ آئے . . . . بھلا کیسے ممکن تھا۔ یقین نہیں آتا کہ مظلوموں کا وہ پیکر مر بھی سکتا ہے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ابھی کسی جانب سے بھاشانی کی آواز اُبھرے گی "کسانو، ہوشیار، عزیزو خبردار . . . . جوت سے جوت جلاتے چلنا کہ ابھی منزل نہیں آئی . . . . ."

اب ہم چٹاگانگ کے پہاڑوں پر ہیں۔ یہیں کہیں، آس پاس ہی چکمہ قبائل آباد ہیں۔ ان قبائل کے غیر مسلم راجہ نے —— پاکستان کے لیے وہ قربانی دی، جسے کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ اس نے، بیوی بچے، گھر بار، الغرض اپنا سب کچھ چھوڑا . . . . اور اسلام آباد میں آن بسا۔ اس راجہ کی آنکھوں میں کئی بار، میں نے یادوں کے آنسو تیرتے دیکھے۔ اس کی زبان سے بارہا ان پہاڑوں پر بسنے والوں کے رومانوی قصے سنے —— میرا جی چاہا اپنے پھیپھڑوں کی پوری توانائی سے چکمہ کے عظیم لوگوں کو سلام محبت پیش کروں . . . . . جن کے ہاں راجہ تری دیو رائے نے جنم لیا تھا۔

جہاز برما کے گھنے جنگلوں پر ہے۔ اللہ کی پناہ! درختوں کا یہ عالم کہ زمین نظر نہیں آتی۔ ہر جانب ہریالی کا راج، بیچوں بیچ کہیں سے کوئی بل کھاتا دریا، ندی یا نالہ گزرتا ہے۔ ان ہی جنگلوں میں برما کے انقلابی ڈیرے ڈالے ہوں گے، جن کی ہیبت سے وہاں کے فوجی حکمرانوں کی نیند حرام رہتی ہے۔

اُڑتے اُڑتے کافی دیر گزر گئی کہ اچانک نعرہ بلند ہُوا: "چین کا علاقہ شروع ہے۔ ہم کینٹان پر محو پرواز ہیں۔" جو جاگتے تھے وہ ہوشیار ہوئے، جو نیند کے خمار میں ڈوبے تھے۔ انھوں نے بھی پلکیں جھپکیں، اور سبھی نیچے جھانکنا شروع ہوئے۔ چین بھی کیا ملک ہے کہ آسمان کی بلندیوں سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ اگر کہیں دریا ہے، تو اس پر ڈیم۔ کھیت ہے تو میلوں تک سیدھی باڑ۔ درخت ہیں تو قطار اندر قطار۔ ہر سمت ناپے تُلے نقشے، اور ہر شے عظمتِ آدم کا منہ بولتا ثبوت۔ ایک نئی دُنیا اور ایک نئے زمانے کے ناکے ہمارے پیش نظر

ہیں۔ پر مجبوری ایسی ہے کہ صرف آسمان کی فضاؤں سے یہ مناظر دیکھنے پر ہی اکتفا کر سکتے ہیں۔

میرے قریب بیٹھے مردِ قلندر اس وقت، ساتویں آسمان ہیں۔ ولایتی شراب کی پوری بوتل ان کے معدے میں متلاطم ہے۔ حالت یہ کہ ہلنے جلنے سے معذور، طاقتِ گویائی ندارد، بدقت تمام جنبشِ ابرو سے "ہل من مزید" کا اشارہ فرماتے ہیں۔ مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس جھٹکے کی تاب نہ لا کر دوبارہ ایک جانب ڈھلک جاتے ہیں۔ حضرت کی حالت کچھ یوں نظر آتی ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مگر بندۂ مومن ہیں۔ چنانچہ ایک آدھ بوتل کے بعد ہی نشاۃ ثانیہ کے دور میں داخل ہوتے ہیں پھر نیا مزاج پکڑتے ہیں، اور گہرا رنگ نکالتے ہیں۔ اس بے خودی کے عالم میں، اسلام پر ایسا لیکچر پلاتے ہیں کہ کوئی سنا کرے۔ اگر کچھ عرصہ پہلے پیدا ہو جاتے تو، علامہ یا مجتہد قسم کی چیز ہوتے، مگر وائے افسوس کہ تاریخی جبر کا شکار ہیں۔

ضیغم حسین زیدی، شعبۂ فوٹوگرافی کے انچارج ہیں۔ دل کے اُجلے، باتوں کے اکھل کھرے، مگر خاصے من چلے واقع ہوئے ہیں۔ پیچھے سے اُٹھ کر ہمارے پاس پہنچتے ہیں۔ مردِ قلندر سے ان کی چھیڑ چھاڑ ہمیشہ سے قائم ہے۔ چنانچہ مردِ قلندر کا شانہ ہلاتے ہیں "حضت! حضت! ذرا آنکھیں کھولیے، نیچے دیکھیے، چین کا علاقہ شروع ہے"...... مردِ قلندر۔ ذرا سا ہوش پکڑتے ہیں۔ زیرِ لب ایک آدھ نامکمل فقرہ ادا کرتے ہیں "آں .... چین ..... ایں ... اوہ .... ہاں چین ..... یعنی ....." اور ان مبارک کلمات کے ساتھ ہی دوبارہ فنا فی اللہ کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

ضیغم زیدی، ایسے مواقع پر حضرت سے نمٹنا جانتے ہیں۔ چنانچہ پل دو پل رُک کر بیک بار حضرت کا شانہ جھنجھوڑتے ہیں اور پوری شدت سے ان کے کان میں کہتے ہیں "ناہد حسن ـــ

اُٹھو۔ اُٹھو۔ بھٹو صاحب نے بُلایا ہے۔" مردِ قلندر، ہرن کی مانند سیٹ پر قلانچ تھا، چوکڑی بھرتے ہیں۔ فوراً ٹائی درست کرتے ہیں، سارا نشہ کافور ہو جاتا ہے۔ اور ... جیب سے پنسل کاپی ٹٹولنے لگتے ہیں۔ یُوں دکھائی دیتے ہیں، جیسے انھیں کبھی نشہ چڑھا ہی نہ تھا۔

ایک قہقہہ پھوٹتا ہے۔ اور مردِ قلندر، ـــ خرافات و مغلظات کی بوچھاڑ کرتے ہوئے دوبارہ اپنی سیٹ پر جم جاتے ہیں .... اور حسبِ سابق بچی کھچی شراب پر پہلی سی شدت کے ساتھ حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ حضرت کا نشہ اُتارنے کا یہ فارمُولا' ـــ ہم لوگ اکثر استعمال میں لاتے رہتے ہیں۔

کوئی ساڑھے سات گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز نے پہلی بار اپنی ناک کا رُخ ذرا نیچے کی جانب کیا۔ اب ہم دوبارہ سمندر پر ہیں۔ کشتیاں، بجرے، اور دیو ہیکل بحری جہاز، زندگی کی مانند رواں دواں۔ غروبِ آفتاب کا سماں ہے۔ سُورج ہماری پُشت کی جانب غروب ہو رہا ہے۔ لیکن سطحِ سمندر پر بنفشی رنگوں کی لاٹ ہمارے سامنے ہے۔ دور سمندر سے چٹانوں کا سلسلہ اُبھرتا ہے۔ جُوں جُوں فاصلے مٹتے گئے۔ یہ چٹانیں پھیل کر آباد جزائر کی شکل اختیار کرتی چلی گئیں۔ جہاز نے آخری چکر لیا، اور دو تنگ پہاڑی نما چٹانوں کے درمیان غوطہ لگایا، اور جیسے انھیں چھوتا سا ہُوا رن وے پر پہنچا۔ جو اگلی چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔

جہاز سے اُترے تو شام کے دُھندلکے چھا رہے تھے۔ اپنی گھڑیوں پر ہنوز چار ہی بجے تھے۔ لیکن ہانگ کانگ میں شام کے آٹھ کا وقت تھا۔ یُوں اپنے چار گھنٹے گردشِ دوراں کو نذر کر کے ـــ فسانوں کی دنیا میں داخل ہُوئے۔ مگر نیچے آتے ہی، ساری کلفتیں، اور ساری تھکاوٹیں دُور ہو گئیں۔ یُوں محسوس ہُوا جیسے ہم جیتے جی حسن بن صباح کی "جنت" میں آن پہنچے ہوں۔ خوبصُورت، نازک، چاق و چوبند، نوجوان، حُوریں، گلابی رنگ کا سکرٹ اور اسی رنگ کی قمیض پہنے، ہماری منتظر تھیں۔ وہ عارض، وہ لب، وہ رُخسار کہ جن کے لیے بِتا دے کوئی زندگی اپنی ـــ! نازو ادا کی پتلیاں، ہانگ کانگ کی پریاں' ـــ ہمارے سامنے تھیں۔ اور نہ صرف سامنے تھیں بلکہ ہماری تلاش میں سرگرداں تھیں۔ ہر حُور کے ہاتھ میں

ایک نامۂ اعمال تھا جس میں اس کے حصے میں آنے والے "بہشتی" کا حسب نسب درج تھا۔ وہ ہنس ہنس کر شیریں آواز میں نام پکارتیں۔ اور "یار لوگ" سینے پر ہاتھ دھرے 'سو جان سے فدا، میں ہوں" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے، سرِ تسلیم جا خم کرتے۔ جوں ہی گوہرِ مقصود ان کے ہاتھ لگتا، اسے بغل میں داب کر ایک جانب چپسل جاتیں۔ یار لوگ ان شیریں آوازوں کے سائے میں ادھر اُدھر تیرتے پھر رہے تھے۔ توقع سے زائد خوشیاں اُن کے تھکے ماندے چہروں کو اپنی مخملیں گود میں سجائے نظر آتی تھیں۔

ایئر پورٹ پر موجود کاروں کی ایک لمبی قطار تھی۔ سو باری باری حوریں اپنے بہشتیوں کو یہاں تک پہنچاتی رہیں۔ پر ہم کہ پیدائشی گنہ گار ہیں، ہانگ کانگ سے بھی گنہ گار ہی گزرے۔ حورِ قصور تو اوروں کے حصے میں آئے کہ ہمیں اس حسین مقام پر بھی مردِ قلندر کو سنبھالنا پڑا۔ حضرت ابھی تک جہاز میں ہی پڑے سے تھے۔ ان کی حور نے انھیں زور زور سے بلایا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے دیے، تب ذرا جا کر ان کی آنکھ کھلی۔ فرمانے لگے "ایں.... آں کراچی آگیا" عرض کیا "حضرت ہانگ کانگ ہے۔ اُٹھیے قدم رنجہ فرمائیے"۔ جس حسینہ کے حصے میں آئے تھے وہ بے چاری اِک نازک اندام، انھیں بھلا کیسے سنبھالتی۔ سو ہمیں اپنی "جنت" کو خیرباد کہہ کر، مردِ قلندر کو تھامنا پڑا۔ راستے میں کار کسی سگنل پر جھٹکے سے رُکی۔ حضرت نے اپنی چشمِ بصیرت وا کی۔ ادھر اُدھر دیکھا، اور پھر لڑھک کر حسینہ کے کندھے پر جا ٹکے۔ اس عالمِ مدہوشی میں بھی حضرت گھاٹے کا سودا کرنے پر تیار نہ تھے۔ لہٰذا سیٹ پر ہماری جانب ان کا دباؤ کم ہی رہا۔

ہوٹل کا نام مینڈرائن تھا۔ خاصی جدوجہد کے بعد ہم حضرت کو اُن کے کمرے تک پہنچا پائے۔ اس کافر ادا حسینہ نے 'ہاتھ جھاڑتے' ـــ ذرا پرے ہٹ کر سیلوٹ مارا، خوبصورت انگریزی میں خدا حافظ کہا ـــ اور پھر اُڑ گئی۔ ہم حیران و پریشان۔ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ بات اپنی سمجھ میں نہ آئی۔ سوچا، الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ کیوں آئی تھیں؟

اور اگر آ ہی گئی تھیں تو پھر یُوں چلے جانا، چہ معنی دارد؟ یعنی ابھی تو — ؏

نہ لب کھلے ہیں، نہ گلے ملے ہیں، اور نہ مے پی ہے

پتہ چلا کہ یہ ہانگ کانگ کی پولیس والیاں تھیں۔ جن کے سامنے بڑے بڑے "قاتل ستے مغرور" بھی کان گرا کر بات کرتے ہیں۔ یہ حسینائیں نہیں بلکہ آفت کی خالائیں ہیں۔ نہ صرف اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہیں۔ بلکہ بیٹھی ہُوئی چڑیا کے پر بھی نہایت آسانی سے گن سکتی ہیں۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ جان بچ گئی۔ پولیس والوں سے دوستی — توبہ توبہ۔ !!

ہانگ کانگ میں سب چلتا ہے۔ دُنیا کے ہر سکے سے لے کر ہر فریب تک۔ ہر ملک کے لوگ بھی موجود ہیں اور دُنیا کی ہر شے بھی دستیاب۔ اور جو شے معدوم ہے، اس کی نقل مطابق اصل موجود۔ نقل مال تیار کرنا یہاں کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی اور جانے کیا کیا بلائیں یہاں تیار ہوتی ہیں، اور ہم آپ ایسے بندگانِ خُدا، انھیں اصل جان کر خریدتے پھرتے ہیں۔ دکان داری میں اپنی طرح خاصے مسلمان واقع ہُوئے ہیں یعنی قیمتوں میں وہی ہیر پھیر، ماپ تول میں کمی بیشی، چیزوں میں گڑبڑ بس یُوں سمجھ لیجیے، ہانگ کانگ انگریز کی سرپرستی میں چلنے والا ایک منظّم بازار ہے۔ جہاں ہر ناجائز شے میسّر ہے۔ کاروبار ہندو مہاجنوں کا زور ہے۔ یُوں تو پاکستانی بھی بہت ہیں، مگر سبھی محنت پیشہ۔ سکھ بھی کیا کم ہوں گے مگر سبھی دربان۔ ہر ملک کے باسی اپنی اپنی مخصوص خصوصیات کے ساتھ یہاں موجود۔

رات کو ذرا چلنے پھرنے نکلے تو ایک دکان کے گیٹ پر سردار جی" سر پر پگڑ سجائے، ہاتھوں میں کڑا ڈالے، کرپان لٹکائے، دربانی کرتے نظر آئے۔ قریب پہنچے تو کسی نے ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کا نعرہ بلند کیا۔ سردار جی مسکرائے اور کہا "تُساں کتھوں آیاں نے" کسی نے جواب دیا "پاکستان سے" ان کی آنکھیں سٹ کر دوبارہ پھیلیں "فیروز پور دا کی حال اے، آپاں اوتھے ہی پیدا ہوئے سی" بتایا "سردار جی پاکستان میں خوب ترقی ہُوئی ہے۔ آپ کا فیروز پور پہلے سے بہت بڑا اور بہت خوبصورت ہو گیا ہے۔"

جب انھیں پتہ چلا کہ ہم سب لوگ، بھٹو صاحب کے ساتھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ تو کہنے لگے "بھٹو ہوراں نوں میرا اسلام آکھیو جے۔ انہاں نوں آکھیو پئی ساڈے لیڈراں نوں وی کجھ مت دین۔ تاں جے بھرواں وانگر ایدھر اودھر آ جا سکیے۔"

ہم نے کہا "بھٹو صاحب تے لڑائی نئیں چاہندے، تُساں مائی اندرا ہوراں نوں کجھ سمجھاؤ۔" سردار جی ہم سب سے پنجابی میں بات چیت کر کے بہت خوش ہوئے۔ ان سے پُوچھا کہ اگر کچھ خریدنا ہو تو کون سی دکان بہتر رہے گی۔ کہنے لگے "جس اسٹور پر میں کھڑا ہوں یہاں تو کبھی نہ جائیے گا۔ یہ تو اپنے ہندوستانی منگے مول بھاؤ میں گردن مار دیں گے۔ یہاں ایک چائنا سٹور ہے۔ چین والے اسے چلاتے ہیں۔ صرف وہیں سے ایک دام اور خالص چیز ملے گی۔" سردار جی نے اپنی گفتگو ایسی ادق پنجابی میں فرمائی کہ جیسے الفاظ کو چھٹنیاں دے دے کر باہر پھینک رہے ہوں (مثلاً ہزاراں کو "صیاراں" ایک سو بیس کو "ہشی ویّاں" وغیرہ وغیرہ) بالخصوص لہجہ تو ایسا گہرا تھا۔ کہ بات بمشکل ہی پلّے پڑتی تھی۔ اس لمحے اپنے احمد سلیمؔ اور افضل رندھاوا بہت یاد آئے کہ وہ یہاں ہوتے تو مشکل آسان کرتے اور بتاتے کہ ہماری پنجابی میں فارسی کی کتنی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ یا پھر سردار جی کی پنجابی پر سنسکرت کا رنگ کتنا غالب آ چکا ہے! تاہم سردار جی سے مل کر یہ احساس ضرور ہوا کہ سکھ جہاں کہیں بھی ہو، خلوص کا بہتا دریا ہے، اور روایتی سادگی کا مجسمہ بھی۔

اب ذرا بنیئے مہاراج کی بھی سُنتے چلیے۔ ایک شام یُوں ہی پھرتے پھراتے بلا مقصد ہم دو تین ساتھی ایک بنیا مہاراج کی دکان میں جا گھُسے۔ مہاراج لکڑی کے تخت پر آلتی پالتی مارے، لکشمی دیوی کے چرنوں میں بیٹھے نظر آئے۔ ایسے کائیاں کہ جیسے ہمیں سُونگھ ہی کر پہچان گئے۔ تاڑ گئے کہ یہ شکار کس دیس سے آیا ہے۔ کس کے ساتھ اور کب آیا ہے؟ بھاگم بھاگ ہمارے پاس پہنچے۔ ہاتھ جوڑ کر کہا "یہاں تک آنے کی زحمت کیوں کی۔ ذرا فون ہلا دیتے۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔" مہاراج ہمیں شُدھ کرنے پر بضد تھے۔ اور ہم خریداری

سے بچنا چاہتے تھے۔ لیکن مہاراج بن پوچھے چیزیں کا انبار ہمارے سامنے لگا رہے تھے۔ بمشکل ان سے جان بچائی، اور باہر نکلے۔ ایک صاحب کہنے لگے "! دیکھا! بنیا آج بھی ہماری دہشت سے ترساں ہے۔" دل میں سوچا، ہم بھی کیا سادہ لوح ہیں۔ خوابوں کی دُنیا میں بستے ہیں۔ آدھا پاکستان تو بنیے کی ڈنڈی کی نذر ہو چکا۔ جو بچ گیا، سو جانے کب تک بچتا ہے۔ مگر ہم خوش ہیں کہ سالا بنیا ہم سے ڈرتا ہے! ہمیں مہاراج کہتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہے!

ہانگ کانگ کے چائنا شاپنگ سنٹر کی بھی سُنتے چلیے۔ یہاں چین کی بنی ہُوئی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں۔ یہ تین منزلہ انتہائی وسیع و عریض عمارت ہے، جو خریدنے والوں کی ریل پیل سے ہر وقت بھری رہتی ہے۔ یہاں لاکھوں ڈالر روزانہ کی فروخت ہوتی ہو گی۔ ہر شے پر قیمت موجود۔ پیسہ اُوپر نہ نیچے، مول تول کا جھگڑا ہی ختم، چیز دیکھیے، پسند کیجیے، پیسے دیجیے اور خاموشی سے باہر نکل آئیے۔ سیلزمین کا کام دراشی دکھانا ہے نہ کہ بھاؤ چُکانا۔ چنانچہ جتنی دیر میں عام دکان دار ایک گاہک کو فارغ کرتا ہے۔ یہ لوگ دس کو فارغ کر دیتے ہیں۔

ہانگ کانگ کے اس ماحول میں بھی چین والوں نے اپنی ساکھ سب سے بہتر قائم کر رکھی ہے۔ چین والے اس بندرگاہ کو اپنے مال کی کھپت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس کمی کو پُورا کر لیتے ہیں، جو انھیں مغربی ممالک کے ساتھ عدم تجارت کی وجہ سے درپیش رہتی ہے۔ جن ممالک کے ساتھ ان کے براہ راست تعلقات نہیں، وہ بھی یہاں سے چینی مال اُٹھاتے ہیں۔ بالخصوص چینی برتن، دو گھوڑا بوسکی اور شنگھائی وغیرہ۔ چین والے کروڑوں، اربوں رُوپے کا زرمبادلہ یہاں سے کماتے ہوں گے۔ میں نے سوچا کیا ہی اچھا ہو کہ یہاں چینی طرز پر "پاکستان شاپنگ سنٹر" بنے۔ ہمارے ہاں کی چیزیں بھی اسی طرح فروخت ہوں۔ اسی طرح گاہکوں کی ریل پیل ہو، اور یُوں ہی دُنیا "پاکستان شاپنگ سنٹر" کا نام حوالے کے طور پر استعمال کرے۔ کروڑوں رُوپے کا زرمبادلہ ملے، مال کی کھپت ہو، اور اندرون ملک مزدوروں کو زیادہ کام اور زیادہ تنخواہ ملے۔ پاکستان کی عزت بنے، اور چار دانگ عالم میں وقار بڑھے۔

مگر اپنے ہاں کے سرمایہ دار "پاکستان شاپنگ سنٹر" کیوں کھولنے لگے کہ وہ تو اپنا سب کچھ باہر لے جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ ہمیں کما کر کہاں کر دینے لگے' کہ انھیں صرف لُوٹنا آتا ہے' لُٹانا نہیں۔

بات شاپنگ کی ہو رہی ہے تو ہانگ کانگ کے دکان داروں کا طریقۂ واردات بھی ذرا سُنتے چلیے۔ بہت سے "بندگانِ خدا" ہانگ کانگ میں بھینٹ ہوئے۔ مگر انھیں بچانا کسی کے بس میں نہ تھا۔ ہم ایک عام سی دکان میں داخل ہوئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے چند سفید فام بھی اسی دکان میں داخل ہوئے۔ حضرتِ دکان دار کی ذرا سی جُنبشِ ابرو سے' دکان کا سارا ماحول ہی بدل گیا۔ اک حسینہ کاؤنٹر سے اٹھی۔ مسکراہٹوں کی حشر سامانیاں' اس مہ وش کے چہرے پہ رقصاں۔ آنکھوں میں خمار لیے' نازاں نازاں ایک جانب بڑھی' اک ادائے کافرانہ سے چٹاخ پٹاخ بوتلیں کھولنا شروع کیں۔ اور پھر ہر نووارد کو بصد ادا ایک ایک بوتل پیش کی۔ یہ ہانگ کانگ کی بیئر تھی۔ مشرق و مغرب کے امتزاج کا وہ حسین مرقع' چشم ما روشن' دلِ ما شاد کی تصویر بنے' آنکھوں کے سامنے موجود۔ ایسے میں بھلا مول بھاؤ کون پوچھتا۔ اتنی ناقدر شناسی کون کرتا۔ اور جب حالت یہ ہو تو بیچارے "دکان دار" کی جانب پلٹ کر کس نے دیکھنا تھا؟۔ اُسے آزادی تھی کہ من بھائے دام لگائے۔ اس غیر متوقع ساقی گری کا اعجاز تھا۔ کہ یہ لوگ اس ساقیِ قیامت خیز کا بار بار' جبینِ نیاز سے شکریہ ادا کیے جاتے تھے۔ اور وہ حسینہ ہر سجدہ ریزہ پہ تبسم اور تکلم کے آدھ کھلے پھولوں کی برسات کیے جاتی تھی۔ مشرق والے تو پہلے ہی تھلے ہیں زیرِ دام تھے۔ رہے سفید فام' تو پہلے ذرا جھجکے اور کسمسائے۔ مگر پھر وہ بھی اس حسین مہمان نوازی کا شکار بن ہی گئے۔ یار لوگ چیزوں کے انبار سے ذرا ابھرتے ـــــ تو مسکراہٹوں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے۔ وہاں سے ذرا فراغت ملتی۔ تو نئے جام میں ڈوب جاتے' چنانچہ وہی ہوا۔ جو کبھی چچا غالب کے ساتھ ہوا تھا۔ اس مُفت کی مے نے بہت سوں کو کھڑے کھڑے فاقہ مستی کی حد تک پہنچا دیا۔ ہانگ کانگ کی بیئر جس کے حلق سے اُتری۔ رہ گیا۔

پھر اس کی جیب میں نہ رُک سکا۔ تین تین گُنا زائد دام دے کر یار لوگوں نے خریداری کی۔ لُٹے گئے۔ تباہ و برباد ہو گئے۔ مگر یہ سب کچھ انھیں اس وقت پتہ چلا جب واپس اپنے ہوٹل کو لوٹے۔ مگر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ان کُشتگان ہانگ کانگ" کے باقی دن 'احساس زیاں' میں گزرے۔ پر ہم نے ان کی ڈھارس بندھائی، کہ اب رات کو بے خبری کی نیند کے مزے لو۔ یہ بھی بڑی قیمتی چیز ہے۔ مگر آپ دکان دار کی معاملہ فہمی داد ضرور دیجیے کہ اس نے شکار کس طرح پہچانا اور پھر کس کمال ہوشیاری سے اسے زیرِ دام لایا۔ اور کس بے مثال فن کاری سے اسے مانوس کیا۔ اور پھر کس چابکدستی سے اس پر "چھری" چلائی۔

ہانگ کانگ والوں نے ہمارے "جذبۂ ایمانی" کا جی بھر کر امتحان لیا۔ اپنی ہر ادا سے ہمیں تڑپایا، جلایا اور ستایا۔ ہر سڑک کے کنارے، ہر بس شاپ پر، ہوٹلوں اور کلبوں کے اندر اور باہر الغرض ہر جگہ حسین جوڑے سرِعام بوس و کنار کرتے پائے۔ کیا موالی لوگ ہیں کہ چلتے چلتے جہاں ترنگ میں آ گئے، وہیں "تصویر" ہو گئے۔ ہم نے فلموں میں ایسے رنگین مناظر بہت دیکھے تھے۔ بلکہ کچھ اندازہ تھا کہ باہر کی دُنیا کس ڈھب پر ہے۔ تاہم یہاں "معاملہ" ہمارے علم سے کچھ فزوں تر ہی نکلا۔ کہ یہاں "کلام شاعر بزبان شاعر" کا زندہ منظر سامنے تھا۔ اپنے بھائی بند 'ان مناظر' کو کنکھیوں سے دیکھتے، ٹھٹھکتے، تھرتھراتے، سامنے آنے والوں سے ٹکراتے۔ اور بمشکل اپنے اعصاب پر قبضہ پا کر گردن سیدھی رکھ پاتے۔ یہ دیکھ کر خاصی پریشانی بھی ہوئی اور مایوسی بھی، کہ ان "بے شرموں" پر کوئی پتھر برسانے والا تھا۔ نہ محلے، گلی کے لڑکے بالے "پاگل ای اوے" کا نعرہ بلند کرتے ملے۔ نہ کوئی زاہد پارسا نظر آیا جو "لاحول" کا ورد کرتا، تکفیر کے فتوے دیتا، تعزیر کے حکم سناتا، جہنم کی پیش گوئی کرتا اور ان "خرمستوں" کا دماغ ٹھکانے کی تدبیر کرتا۔ نہ کوئی محتسب دیکھا، جو ان کی پیٹھ پر دُرّے برسانے کا حکم دیتا۔ اور تو خیر چھوڑیئے، وہاں کی پولیس ہی اگر ذرا بھر بھی فرض شناس ہوتی، تو کم از کم ان لوگوں کو "فحش حرکات" کے الزام میں گرفتار کرتی۔ اور یوں اپنی کارکردگی میں حسین اضافہ کرتی۔ یقین کیجیے، وہاں کوئی اس بات کو اتنی اہمیت بھی نہیں

دیا کر رُک کر یا پلٹ کر ایک نظر دیکھ ہی لے۔ ہر کوئی اپنی دُھن میں مگن، ان جوڑوں کے قریب سے یُوں گزر جاتا دکھائی دیا، جیسے ہم اپنے ہاں سڑک پر لگے پوسٹ بکس کے قریب سے گزر جاتے ہیں، بغیر بُرا منائے، شور مچائے اور پتھر برسائے۔ تاہم، ہم نے دل میں کہا، "سالو! نہ ہوئے تم اپنے ملک میں، یار لوگ مار مار کر تمھاری ہڈیاں سُرمہ بنا دیتے۔ اس لیے نہیں کہ انھیں یہ سب کچھ ناپسند ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اُن بے چاروں کو یہ سب کچھ چھُپ چھُپ کر کرنا پڑتا ہے۔

رہی اچھائی بُرائی کی بات تو دُنیا کے ہر حصے میں اس کے معیار بدل جاتے ہیں۔ جو چیز ایک جگہ بُرائی ہے، دُوسری جگہ اچھائی سمجھی جاتی ہے۔ اصل سچائی کیا ہے؟ اور کہاں دستیاب ہوتی ہے؟ — اس کا زیادہ سے زیادہ یہی جواب دیا جا سکتا ہے، کہ ہر فرد، ہر طبقے، اور ہر قوم کی اپنی اپنی سچائیاں ہیں۔ جو ایک دُوسری سے مختلف بھی ہیں، اور تاریخی اور سماجی حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی بھی رہتی ہیں۔ لوگ ان ہی حالات کی زنجیروں میں مقید، روایات کے کولھو سے بندھے، اپنے اپنے طے شدہ دائروں میں چکر لگاتے لگاتے زندگی کا سفر کاٹ دیتے ہیں۔ اس میں ان کی مرضی یا خواہش شامل ہو نہ ہو، کون پُوچھتا ہے۔ اور کیا فرق پڑتا ہے؟ — بے چارے لوگ زندگی کا بوجھ کمر پر لادے گھسٹتے گھسٹتے قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں!

ہانگ کانگ فی الحقیقت رات کا شہر ہے۔ دن میں اس کی حالت نشے سے ٹوٹے افیونی کی مانند ہے۔ مگر ادھر شام ڈھلی اور یہ بیدار ہُوا۔ نائٹ کلب یہاں کی خصوصیت ہیں۔ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نائٹ کلب کُھلے ہیں۔ بازار سجے ہیں۔ جسم کی فروخت عام ہے۔ بلکہ دُنیا میں سب سے زیادہ "گوشت" یہیں بکتا ہے۔ ہر رنگ، نسل، علاقے، اور مذہب کا انسانی گوشت یہاں دستیاب ہے۔ آپ کو اشتہار نظر آئیں گے۔ "آسٹریلیا کی حسینائیں آپ کی منتظر ہیں"۔ "جاپان کی آفت زادیاں دستیاب ہیں"، یا "امریکہ کی مست جوانیاں آپ کی منتظر ہیں"۔ عوام کی خدمت میں یہاں کی حکومت بھی پیش پیش ہے۔ ہانگ کانگ میں جو پہلا سرکاری کتابچہ آپ کے ہاتھ لگے گا۔ اس میں قحبہ خانوں کے ایڈریس ہوں گے۔ تاکہ شائقین کو زحمت ہی نہ

کرنا پڑے۔ فون اٹھا کر، فوراً آرڈر بک کرایا جاسکے۔ ان قحبہ خانوں کو "گائیڈ کمپنیوں" کے نام سے پکارا جاتا ہے!

چونکہ یہاں برطانیہ کا سکہ چلتا ہے۔ اس لیے حکومت، خواتین کی "بہبود" کا خاص خیال رکھتی ہے۔ ان گائیڈ کمپنیوں کے ذریعے، ملازمت کے فراخ مواقع یہاں کی خواتین کو مہیا کیے جاتے ہیں" تاکہ ہانگ کانگ کی بہو بیٹیاں بے کار نہ بیٹھیں، ہاتھ پیر ہلائیں، پیسے کمائیں، خود بھی کھائیں اور حکومت کو ٹیکس بھی ادا کریں۔

لہٰذا یہاں کی "ویلفیئر حکومت" ہانگ کانگ میں داخل ہونے والوں کو ان گائیڈ کمپنیوں کی جانب راغب کرتی ہے۔ تاکہ سیاح حضرات اگر چاہیں تو ان کمپنیوں سے رجوع کرکے اپنے لیے کوئی قیامت خیز ساتھی پسند کرلیں۔ یہ خاتون آپ کو ہانگ کانگ کی سیر کرائے گی۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومے گی۔ آپ کے ساتھ پیئے پلائے گی، ڈانس ہالز میں آپکا ساتھ دے گی..... اور بس۔ "آں کارِ دیگر" کے لیے نئے سرے سے معاملات طے کرنا ہوں گے۔ لیکن آپ کو یقین دلایا جائے گا کہ معاملات ہر لمحہ طے ہوسکتے ہیں، مسئلہ صرف اصل زر کا ہے۔

کلبوں میں ہر قسم کا ڈانس ہوتا ہے۔ لباس کے ساتھ بھی اور لباس کے بغیر بھی، عورت ہر میز پہ مل سکتی ہے، اور شراب ہر چوک سے۔ دنیا کے ہر خطے کے لوگ، سیاح، تاجر، اسمگلر ــ اور جانے کون کون آپ کو یہاں بآسانی دستیاب ہوں گے۔ ڈاکہ زنی، اور جیب تراشی یہاں کا محبوب مشغلہ ہے۔ دن دہاڑے بنک لوٹنے کی وارداتیں عام ہیں۔

۲۰ مئی کی شام، پاکستانیوں کا اجتماع ہوا جس سے وزیراعظم بھٹو نے خطاب کیا ــــ ہانگ کانگ میں بسنے والے تین چار ہزار نفوس نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ لیکن سب پاکستانیوں کو خبر نہ ہوسکی۔ چنانچہ رات گئے تک بے چارے مختلف وفود کی صورت میں آتے رہے۔ اجلاس کا اہتمام دفتر خارجہ کی ذمہ داری تھی۔ لیکن اپنا دفتر خارجہ جیسا کہ ہے ــ بہت باکمال ہے۔ لہٰذا ــــ جتنا کچھ ہوگیا، اسے بھی غنیمت ہی سمجھنا چاہیے۔ اگر اتنا بھی نہ کرتے، تو

ہم نے ان کا کیا بگاڑ لینا تھا۔

ہانگ کانگ میں پاکستانیوں سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم بھٹو نے کہا: "میں چونکہ اس وقت ملک سے باہر ہوں اس لیے خارجہ تعلقات کے موضوع پر آپ سے بات چیت کروں گا۔ ہمارے تعلقات، کسی ملک سے کشیدہ نہیں ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ بہتر پیش رفت ہوئی ہے۔ مگر ہم اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتے۔ جموں و کشمیر کا مسئلہ، بنیادی مسئلہ ہے۔ اسے طے کیے بغیر پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ قرار دیا جائے۔ ہم جارحیت اور جنگ پر یقین نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ایٹم بم بنانے کے خلاف ہے۔ مگر ہم پسماندہ ملک ہیں۔ ہمیں توانائی کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے کارخانے چلانے کے لیے بجلی کی ضرورت ہے۔ ہم نے فرانس سے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کا سودا کیا ہے۔ ہم اس سے حاصل شدہ ایٹمی توانائی کو، بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔ ہم توانائی کو پُرامن مقاصد کے لیے استعمال کریں گے۔ آج کا دور ایٹمی توانائی کا دور ہے۔ پاکستان کو بھی ایٹمی ٹیکنالوجی سیکھنے کا اسی طرح حق ہے جس طرح دوسرے ممالک کو ہے۔ لیکن مسئلہ بڑا واضح اور بڑا صاف ہے۔ یہ پابندی صرف ہم کالے لوگوں پر ہے۔ یا پھر "زرد اقوام" پر ہے۔ سفید فام نسل کی ہر چیز پر اجارہ داری ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم کالے عوام" بھی سائنسی دور میں داخل ہوں۔ ہم تیسری دنیا کا اتحاد چاہتے ہیں۔ ہم ایک منصفانہ اقتصادی نظام چاہتے ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کو غور کرنا چاہیے۔ اتحاد کے لیے کوششیں تیز کر دینی چاہییں۔" جب وزیر اعظم تقریر کر کے بیٹھے۔ تو انھوں نے شیخ رشید کو آواز دی۔ کہ اگر وہ کچھ کہنا چاہیں تو بولیں۔ شیخ صاحب کو اور بہت سے لوگوں کی طرح، اس تقریب کی اطلاع ہی نہ تھی۔ لہٰذا، کہیں باہر جا چکے تھے۔ میں نے وزیر اعظم کو بتایا کہ شیخ صاحب موجود نہیں ہیں۔ بھٹو صاحب نے ادھر اُدھر دیکھا۔ پیرزادہ نظر آئے۔ اُنھوں نے مسکراتے ہوئے پیرزادہ کی جانب اشارہ کیا۔ اور کہا "بھئی ہمارے اشوک کمار بھی بیٹھے ہیں۔ اگر وہ کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔" سبھی لوگ ہنس دیے۔ پیرزادہ صاحب

نے سر کو نفی میں جنبش دی، اور یوں یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی کرتا چلوں کہ جناب بھٹو نے بے پناہ حسِ ظرافت پائی ہے۔ اُن کے پاس بات کہنے کا اپنا انداز ہے۔ اور شاید بہت ہی خوبصورت انداز ہے۔ بات کی تہ میں کوئی نہ کوئی خاص واقعہ یا بات ضرور موجود ہوتی ہے جسے وہ ہنستے مسکراتے کہہ جاتے ہیں۔ اب یہ ان صاحب پر منحصر ہے کہ وہ اس خاص فقرے کے اصل معانی سمجھیں، جنھیں مخاطب کر کے بھٹو صاحب نے کوئی فقرہ ادا کیا ہو۔ بھٹو صاحب کے یہ خوبصورت جملے دراصل ہلکی پھلکی دوستانہ تنقید کے مترادف ہوتے ہیں۔ یوں تو ایسے سیکڑوں خوبصورت جملے میں نے ان کے منہ سے سُنے۔ (یقیناً کئی بار اپنے متعلق بھی) تاہم صرف اس دورے کے دوران ان کی طرف سے کہے گئے، دو جملے یہیں درج کیے دیتا ہوں۔

اسی دورے کے دوران ہم چین کی شنگ وا یونیورسٹی بھی گئے (اس کا حال آپ آگے چل کر پڑھیں گے) یونیورسٹی کے ڈائریکٹر جب اپنی تعارفی تقریر ختم کر چکے تو انھوں نے سوال و جواب کی دعوت دی۔ بھٹو صاحب نے ہم سب کی جانب دیکھا، کہ ہم اُٹھ کر کوئی سوال کریں۔ پیرزادہ صاحب اُٹھے، اور پہلے ذرا سے کھانسے، پھر رُومال مُنہ پہ پھیرا، اور سوال کرنا چاہا۔ اتنا وقفہ بھٹو صاحب کے لیے کافی تھا۔ فوراً مسکرا کر کہا "غالباً آپ مخلوط تعلیم پر کوئی سوال پوچھنا پسند کریں گے۔" اور محفل کشتِ زعفران ہو گئی۔

تاج محمد لنگاہ، سوالات کرنے کے سلسلے میں خاصے فراخ دِل ثابت ہوئے تھے۔ اگر کہیں مُرغی بھی نظر آجاتی تو اس کے متعلق بھی دو چار سوال ضرور کر ڈالتے۔ بھٹو صاحب نے پیرزادہ صاحب کے بعد لنگاہ کی جانب دیکھا اور کہا "آپ بھی اُٹھ کر شوق پُورا کر لیجیے۔ آپ کے سوال کے بغیر ہم چین سے واپس کیسے جا سکتے ہیں۔" لنگاہ فوراً اُٹھے اور سوال کی توپ چلا دی!

شنگ وا یونیورسٹی کی اسی محفل میں موضوعِ سخن 'چینی' اور اُردو زبان کے موازنے کی جانب پھسل گیا۔ بحث ہو رہی تھی کہ مخصوص سائنسی اصطلاحات کو چین والے کیا، اپنی ہی زبان

میں ادا کرتے ہیں۔ یا دوسری زبانوں کی سائنس اصطلاحات کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ اتنے میں اُردو کا ذکر بھی آگیا۔ بھٹو صاحب نے صرف ایک جملے میں ساری بحث سمیٹ دی۔

"دراصل چینی ایک قدیم زبان ہے جس نے تاریخی ارتقا سے جنم لیا ہے۔ اس میں وُسعت اور گہرائی موجود ہے۔ لہٰذا اسے باہر سے الفاظ اپنانے کی ضرورت نہیں۔ ہماری زبان نے قوموں کے اتصال سے جنم لیا ہے لہٰذا اس میں ہندی، فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں۔ ہماری زبان کی ہیئت ایسی ہے کہ ہمیں دوسری زبانوں کے الفاظ اپنانے پڑتے ہیں اور بالخصوص سائنس کے سلسلے میں ہمیں الفاظ اپنانے چاہئیں۔" شنگ وا یونیورسٹی کے بڑے بڑے سکالر اس محفل میں موجود تھے۔ لیکن جب بھٹو صاحب نے اپنا تجزیہ پیش کیا تو ہر جانب سے داد و تحسین کے ساتھ ہال گونج اُٹھا۔

خیر یہ تو تھے جملہ ہائے معترضہ، چلیے ہم آپ کو واپس ہانگ کانگ لیے چلتے ہیں ——

ہانگ کانگ بہت مہنگا شہر ہے۔ یہاں علم بھی مہنگا ہے۔ زندگی کے سارے لوازمات بھی، حتیٰ کہ موت بھی۔ چونکہ انگریزوں کے زیرِ تسلط ہے۔ اس لیے انگریزی ٹائپ نظامِ تعلیم ہے۔ لہٰذا بچوں کو تعلیم دلانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ لوگ یہ "مہنگا شغل" اختیار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور یہی ان کے آقاؤں کی خواہش بھی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا یہاں کوئی بندوبست نہیں، معدودے چند خوش نصیب طلبا جو اعلیٰ تعلیم کی حد کو چھونا چاہتے ہیں، انھیں انگلینڈ جا کر ہی تعلیم مکمل کرنا پڑتی ہے۔ تاہم ایسے واقعات "شاذ و نادر" ہی ہوتے ہیں۔

ہانگ کانگ میں کمونسٹوں پر خاص نظر رکھی جاتی ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ جب کبھی ہانگ کانگ کے کمونسٹ لہر میں آتے ہیں۔ راتوں رات شہر کی دیواروں کو انقلاب کے نعروں سے سُرخ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بے چاری پولیس ان دیواروں کو دھوتی پھرے گی اور زیرِ زمین کمونسٹوں کی تلاش میں ماری ماری پھرے گی۔ ہمیں پتہ چلا کہ چین نواز کمونسٹوں کا خاصا مضبوط حلقہ یہاں موجود ہے۔ لہٰذا برطانوی انتظامیہ ان سرپھرے انقلابیوں سے خاصی

تنگ رہتی ہے۔

ہانگ کانگ ریل کے ذریعے چین سے ملا ہوا ہے۔ جس جگہ سے چین کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اُس کے قریب ہی ایک پہاڑی پر بہت بڑی دُوربین نصب ہے۔ سیاح لوگ یہاں پیسے ادا کرتے ہیں۔ اور دُوربین کے ذریعے چین کے قریبی کیمون میں لوگوں کو کام کاج کرتے دیکھتے ہیں۔ اور یُوں، سرحد پر کھڑے ہو کر چینی زندگی کی حرکت اور توانائی کا دُوربین کے ذریعے مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں سی آئی اے والوں کا گمنام دفتر بھی قائم ہے۔ اس جگہ بیٹھ کر وہ چین کی اندرونی پالیسیوں سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جی بھر کر غلط پیش گوئیاں دُنیا بھر میں پھیلاتے پھرتے ہیں۔

ہانگ کانگ کو دُنیا بھر کے عیاشوں کا اڈا ہے۔ زمانے کے بدنام اسمگلر یہاں موجود ہیں۔ قاتل اور ڈاکو موجود ہیں۔ یہاں کی پولیس رشوت کے معاملے میں خاصی ایڈوانس واقع ہوئی ہے جب بدمعاش، اسمگلر یا پولیس والے، کسی قانونی شکنجے میں پھنس جائیں تو پھر وہ یہاں سے فرار ہو کر تائیوان میں پناہ لے لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہانگ کانگ اور تائیوان دراصل دونوں جزائر چین کا حصہ ہیں۔ تاہم ہانگ کانگ انگریز کے ناجائز قبضہ میں ہے۔ اور تائیوان امریکہ کے قبضے میں۔ تائیوان وہی جگہ ہے جہاں کمیونسٹوں سے شکست کھا کر کائی شیک جا چھپا تھا۔ یہ جزیرہ ابھی تک سامراجی اڈہ ہے۔ اور چین والوں کے لیے مسئلہ کشمیر کی مانند ہے۔ ایک شام، عبدالرازق خان اپنے کمرے سے غائب پائے گئے۔ ان کے کمرے میں بار بار جھانک کر دیکھا، لیکن وہ کہیں نظر نہ آسکے۔ سوچا، خان صاحب بھی ہانگ کانگ کی روشنیوں کے اندھیرے میں کھو گئے۔ آدمی آخر آدمی ہے۔ کھو جانے میں کیا دیر لگتی ہے؟ رات بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ خان صاحب سدا کی مانند ہشاش بشاش، اور ہنستے مسکراتے ہوٹل میں واپس پہنچے۔ ہم نے بھاگ کر خان صاحب پر حملہ کیا۔ ان کے معنی خیز انداز میں "غائب" رہنے کا پس منظر جاننا چاہا۔ خان صاحب کہ صاحب فراست ہیں، ہمارے اَن گنت سوالات کا مُدعا سمجھ گئے۔

بتانے لگے: "آج دن میں، دو پٹھان یہاں آ گئے۔ وہ یہاں اپنا چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس دعوتِ طعام تھی۔ سو یُوں سرِ شام سے غائب تھا۔" خاں صاحب نے بتایا کہ ہانگ کانگ میں چپل کباب اور نان کھانے کو ملے ہیں۔ اور یُوں سمجھو کہ بس مزہ ہی آ گیا۔ یوں محسوس ہُوا جیسے پشاور میں بیٹھے ہوں۔

جو دو پٹھان، خان صاحب کو دے گئے تھے۔ وہ یہاں ہوٹل کا کام کرتے ہیں۔ تکہ کباب اور نان، کی دکان چلاتے ہیں۔ یار لوگ اس خوش خبری پر بہت خوش ہُوئے۔ دکان کا فوراً اتا پتہ پُوچھ کر بھاگے کہ "چپل کباب" کھا کر مُنہ کا ذائقہ تو "دیسی" کریں۔ یُوں رات بارہ بجے، ہم نے ہانگ کانگ میں چپل کباب کی سوندھی سوندھی خوشبو سے — وطن کو یاد کیا۔

ہانگ کانگ کی تاریخ، بہت سبق آموز ہے۔ پچھلی صدی میں انگریز نے خاقانِ چین پر فوج کشی کی۔ یہ جنگ، تاریخ میں "جنگِ افیون" کے نام سے مشہور ہے۔ انگریز کا مطالبہ تھا کہ چین میں افیون فروخت کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ جب کہ چین میں افیون کے خلاف ردِعمل تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز کے فروخت کردہ افیون سے ملک کی آبادی کا ایک قابلِ ذکر حصہ، افیون کا عادی ہو چکا تھا۔ اور نظر آتا تھا کہ اگر افیون کی فروخت پر قدغن نہ لگائی گئی تو پُورا ملک نشے کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔ چنانچہ شہنشاہ نے افیون کی فروخت پر پابندی عائد کرنے کا اعلان کر دیا۔

یہ پابندی انگریز اور امریکی تاجروں کو پسند نہ تھی۔ انگریز ہندوستان میں افیون اُگاتا تھا اور چین میں فروخت کر کے — کروڑوں روپے کماتا تھا۔ لہٰذا انگریز نے چین پر حملہ کر دیا۔ شہنشاہ کو شکست دی۔ ہانگ کانگ کا جزیرہ، ۹۹ سال کے لیے لیز پر لے لیا۔ (تقریباً دس سال بعد یہ ۹۹ سال ختم ہونے والے ہیں) اور افیون کی تجارت کھول دی گئی۔ چنانچہ ہانگ کانگ ابھی تک حکومتِ برطانیہ کے زیرِ سایہ ایک آزاد بندرگاہ ہے۔

ہانگ کانگ، — صرف ایک جزیرے کا نام ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے

ملحقہ جزائر بھی اسی بندرگاہ کا حصہ ہیں۔ مثلاً کولون وغیرہ۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جیسے' لاہور تو پورا شہر ہے۔ اور گلبرگ اس کا ایک حصہ۔ اور باہر کی دنیا میں لاہور کی بجائے۔ لوگ گلبرگ کا نام جانتے ہوں۔ چینی یہاں کی مقامی زبان ہے۔ تاہم انگریزی زبان بھی خوب بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

غربت اور افلاس کے اندھیرے ہانگ کانگ میں بھی موجود ہیں۔ چار پانچ لاکھ افراد ایسے بھی ہیں جن کے پاس رہائش کا کوئی بندوبست نہیں۔ چنانچہ وہ جھونپڑا نما کشتیوں میں بستے ہیں اور یوں سمندر میں رہ کر' اپنا وقت پورا کرتے ہیں۔ چوری چکاری، نوسربازی، فراڈ اور اس قبیل کے دوسرے فنونِ لطیفہ عام ہیں۔ لوگ ان ہی سے فارغ نہیں ہوتے اور یوں زندگی بسر کر جاتے ہیں۔

ہانگ کانگ اور کولون کے درمیان' کشتیوں سے سفر ہوتا ہے۔ تاہم اب ایک سمندر دوز سڑک بھی بنائی گئی ہے۔ یہ سڑک دو رویہ ہے۔ اور سمندر کے نیچے بنائی گئی ہے۔ انتہائی شاندار حالت میں ہے۔ اور یوں صرف پندرہ منٹ میں' دونوں جزیروں کا درمیانی فاصلہ طے ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل' کار پہ یہ سفر ممکن نہ تھا۔ صرف فیری کے ذریعے لوگ ادھر اُدھر جایا کرتے تھے اس سڑک کے دونوں جانب ٹول ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے جو ہمارے پانچ روپے کے برابر ہوگا۔

ہانگ کانگ میں سب سے زیادہ قابلِ دید شئے یہاں کی ٹیکسیاں ہیں۔ نئے ماڈل کی مرسیڈیز کاریں یہاں بطورِ ٹیکسی چلتی ہیں۔ ہر ٹیکسی میں ایک وائرلیس فٹ ہے۔ جس کے ذریعے' وہ اپنے اڈے سے رابطہ رکھتا ہے۔ اور اپنی پوزیشن بھی بتاتا رہتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اڈے والے اسے وائرلیس پہ ہی بتاتے ہیں کہ فلاں سڑک پہ ایک سواری کھڑی ہے۔ اور اس طرح وہ' بتائی ہوئی سڑک پہ سواری لینے پہنچ جائے گا۔

دراصل وہاں' سرِ راہ چلتی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکنے کا طریقہ مروج نہیں ہے۔ ہر کمپنی کے پاس خاصی تعداد میں ٹیکسیاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب آپ کو ٹیکسی چاہیے آپ ان کمپنیوں میں سے کسی کو فون کر دیجیے۔ وہ ڈرائیور کی پوزیشن دیکھ کر آپ کو بتا دیں گے کہ پانچ یا دس منٹ

بعد فلاں نمبر کی گاڑی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ نہ انتظار کی زحمت، نہ سڑک پر دھوپ میں پگھلنے کی ضرورت، اور نہ ہر گزرتی کار کو ہاتھ دے کر "ٹیکسی ٹیکسی" چلانے کی ضرورت۔ بتائے ہوئے وقت پر، گاڑی آپ کے پاس ہوگی، بیٹھ جائیے اور مزے کیجیے۔ مگر یہاں کے ڈرائیوروں سے بچیے کہ انھوں نے یہاں بھی اپنی برادری کا خاصا بھرم قائم کر رکھا ہے۔ میٹر ان کے ہوا سے بھی تیز ہیں۔

یادش بخیر: ہانگ کانگ میں پہلی رات تھی۔ اپنے مسعود محمود نشے میں دھت لڑکھڑاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک عدد حسینہ بھی تھی۔ پوچھا "فرمایئے؟" کہنے لگے "کیا یہ میرا کمرہ ہے؟" عرض کیا "شراب خانہ خراب اور پھر شباب کے ساتھ نے آپ کو بہکا دیا ہے اور آپ بھول کر یہاں آن پہنچے ہیں۔" عین اس لمحے ایک گٹھے ہوئے جسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے انتہائی مؤدبانہ طریقے سے مسعود کو کہا "جناب! آپ کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ چنانچہ ہمیں ہدایات ملی ہیں۔ کوئی مقامی مرد یا عورت آپ کے کمروں میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ مہربانی کیجیے، اس لڑکی کو باہر بھیج دیجیے۔ یہ آپ کی حفاظت کا تقاضا ہے۔" ڈائریکٹر صاحب نشے میں تو تھے ہی۔ اس دخل در معقولات پر طوفان کی مانند پھٹ پڑے "بکواس بند کرو حرامزادے۔ سور کے بچے۔ تم مجھے کیسے روک سکتے ہو۔ میں خود سیکرٹری کا ڈائریکٹر ہوں۔" وہ آدمی بڑے ضبط سے گالیوں کی بوچھاڑ پی گیا اور کہنے لگا "جناب آپ بھول رہے ہیں۔ آپ دوسرے ملک میں ہیں۔ یہاں آپ کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔" یہ کہہ کر اس نے لڑکی کو اپنی زبان میں کچھ کہا اور وہ اچانک باہر کو چھوٹ لی۔ مسعود نے اس آدمی کو گریبان سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے باتھ روم کی دیوار تک لے گئے "سور کی اولاد کیا وہ تیری بہن ہے تیری ماں کا ....." میں فوراً اٹھا کہ ان دونوں حضرات کو علیحدہ کروں۔ تاہم میرے پہنچنے سے قبل ہی چٹاخ پٹاخ کی دو تین آوازیں ابھریں۔ نتیجۃً ڈائریکٹر صاحب ڈکراتے ہوئے فرش پر آن رہے اور وہ شخص کسی ماہر قصاب کی مانند ان کی چھاتی پر اچھل کر بیٹھ گیا۔ غالباً اس نے

جوڈو کراٹے کے ہاتھ دکھائے تھے۔ میں نے بھاگ کر اسے پرے دھکیلا ”یہ میرا کمرہ ہے یہاں فساد نہ کرو بھائی لوگو! اور تم کو کیا حق پہنچتا ہے کہ تم ہمارے ملک کے آدمی پر یوں ہاتھ اٹھاؤ۔ بے شک غلطی ان حضرت کی بھی ہے، مگر مار پٹائی کا کوئی جواز نہیں۔“ اس آدمی نے کہا ”میں نے بہت برداشت کیا لیکن یہ ماں بہن کی گالی کیسے دے سکتا ہے۔ یہ کیسا شخص ہے جسے اپنی عزت کا پاس ہے، نہ اپنے ملک کی عزت کا۔ میں اس واقعے کو آپ کے وزیر اعظم تک پہنچاؤں گا۔“ مسعود کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ رہی سہی کسر اس آدمی کی دھمکی نے پوری کر دی۔ مجھے پنجابی میں کہنے لگے ”خدا کے لئے اس آدمی کو سمجھاؤ۔ معاملہ ختم ہو جانا چاہئے۔ اگر بھٹو صاحب تک رپورٹ پہنچ گئی تو میری بہت بے عزتی ہوگی۔“ میں نے دل میں سوچا، گویا اب آپ کی عزت افزائی ہو رہی ہے جو بعد میں بے عزتی ہوگی۔ لیکن معاملہ صرف ڈائریکٹر صاحب کا نہ تھا ملک کی عزت کی بھی بات تھی۔ میں نے اس آدمی سے کہا ”بھئی تمہیں ان پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیئے تھا۔ تاہم یہ صاحب تمہیں ”معاف“ کرنے پر تیار ہیں۔ بات بڑھے گی تو تم بھی نقصان میں رہو گے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔ جو کچھ بھی ہوا ہے، اسے بھول جائیں۔“ آدمی معقول تھا۔ فوراً رضامند ہو گیا۔ چنانچہ ”دونوں سیکورٹی والوں“ نے ایک دوسرے کو یوں گلے سے چپکایا جیسے بچپن کے یار ہوں۔ یوں بات ٹل گئی۔ جب وہ شخص چلا گیا تو مسعود سر جھکا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ اب ان کا دماغ موزوں ہو چکا تھا، کہنے لگے، ”خدا جانے! یہ شخص ہوٹل سیکورٹی سے متعلق تھا یا پھر یہاں کی انتظامیہ کے کسی خفیہ محکمے سے تھا۔ اس سے شناختی کارڈ مانگنا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا ”وہ جو کوئی بھی تھا، اب جا چکا لیکن آپ آئندہ کے لئے احتیاط کریں۔ پرہیز بہرحال علاج سے بہتر ہوا کرتا ہے۔ بزرگوں کا قول تو یہی ہے۔ آگے آپ کی مرضی۔ ویسے اب جا کر آرام کریں۔ رام بھلی کرے گا۔“

اس کے بعد ہانگ کانگ میں جتنا عرصہ رہے، باہر کم ہی نکلتے پائے گئے۔ دوسرے دن میرے پاس آئے۔ کہنے لگے ”میں بہت پریشان ہوں۔ رات بھر سو نہیں سکا۔ کہیں

مجو صاحب تک بات نہ پہنچ جاتے۔ وہ آدمی بڑا احمق اور ضدی سا تھا ......"

میں نے انہیں بتایا "گھبرائیے نہیں۔ وہ شخص نہ احمق تھا اور نہ ضدی۔ میں نے پتہ کرایا ہے۔ وہ ہوٹل یا مقامی انتظامیہ کا فرد نہ تھا۔ ہوٹل والوں نے بتایا ہے کہ وہ یقیناً اس قحبہ خانے کا غنڈہ ہوا ہوگا۔ جہاں سے آپ اس محترمہ کو لائے تھے۔ یہاں قحبہ خانوں کے مالک سیاحوں کے ساتھ یہ فراڈ اکثر کرتے ہیں۔ قحبہ خانے کا غنڈہ ساتھ ساتھ چل پڑتا ہے۔ وہ پھر چھاپہ مار کر لڑکی "برآمد" کر لیتا ہے یا وہ خواہ مخواہ لڑائی جھگڑا شروع کر دے گا اور لڑکی واپس بھاگ لے گی۔ یوں وہی لڑکی پندرہ بیس منٹ بعد اسی قحبہ خانے سے نئے "مسافر" کے ساتھ نئی جگہ روانہ ہو جائے گی۔ یوں ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور ایک ہی رات میں کئی کئی گاہک بھی صاف   لہٰذا آپ کی شکایت کرنے کون آئے گا؟ یہ ہانگ کانگ کے ٹھگ ہیں۔ ہم آپ سے کچھ اوپر ہی ہوں گے نا؟"

مگر مسعود کا دل نہ مانتا تھا۔ لہٰذا جب تک ہانگ کانگ میں رہے۔ پریشاں پریشاں رہے لیکن جوں ہی دوبارہ جہاز پر بیٹھے اور بزعم خود خطرے کا سائرن ٹلتے نظر آیا تو یوں گردن اکڑا کر سیٹ پر بیٹھ گئے جیسے چنگیز خان کے وارث وہی ہوں۔

اسے اتفاق کہہ لیجیے کہ اس سے قبل ڈیرہ اسمٰعیل خان میں بھی اس سے ملتا جلتا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ نصراللہ خٹک وزیراعلیٰ سرحد نے ڈنر دیا۔ اس پر ڈائریکٹر صاحب بھی تشریف لائے۔ نصراللہ خٹک دل کا بہت حلیم مگر غصے کا بہت سخت انسان ہے۔ دوران طعام خوری' اس نے ڈائریکٹر صاحب کو اپنے پاس بلایا۔ یہ حسب معمول تھرتھر کرتے پہنچے۔ وہاں میرے علاوہ کئی وزراء بھی موجود تھے۔ نصراللہ نے میری جانب منہ کر کے آنکھ دبائی یعنی میں حملہ کرنے لگا ہوں پھر ڈائریکٹر صاحب کی جانب متوجہ ہوا "ایف۔ ایس۔ ایف میں تمام حرام زادے ہیں"..... ڈائریکٹر صاحب گھبرا گئے "سر! حکم کیجیے کس سے قصور ہوا۔ آپ اشارہ دیجیے' میں ابھی اسے برخاست کیے دیتا ہوں" نصراللہ نے کہا "تم کیسے برخاست کرو گے۔ سب سے بڑے شیطان تو تم

خود ہو۔ تمھارے آدمیوں نے کہیں چوری کی ہے۔ کبھی اُن کے خلاف ایک شکایت آتی ہے کبھی دُوسری۔ تمھارے آدمیوں نے رمضان میں شراب پی کر ایک دُوسرے پر گولیاں چلائی ہیں۔ تم اتنے اُلّو کے پٹھے ہو کہ تمھیں کچھ پتہ نہیں۔" مسعود نے جو یہ تیور دیکھے تو تھر تھر کانپنے لگا۔

"سر! سر! آپ بجا فرماتے ہیں۔"

نصراللہ نے کہا: "تم پورس کے ہاتھی ہو۔ وقت بتائے گا تم سب سے زیادہ بُزدل ہو۔ اور وقت بتائے گا تم کتنا نقصان پہنچاتے ہو۔"...... نصراللہ اپنا یار ہے۔ اپنی مانند گنوار ہے۔ مگر میں آج بھی سوچتا ہوں، اس نے کس قدر پیغمبرانہ بات کہی تھی!

جب ڈنر ختم ہُوا۔ تو مسعود محمود فوراً میرے ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ کہنے لگے "میں اگر بھٹو صاحب سے شکایت کروں اور انھیں یہ بتاؤں کہ نصراللہ نے انھیں گالی دی ہے تو کیا تم میری گواہی دو گے۔" میں نے کہا: "نصراللہ نے بھٹو صاحب کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اور پھر میں گواہی نہیں دیا کرتا۔ یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ آپ جانیں۔ ویسے بھی نصراللہ میرا دوست ہے۔"...... تاہم مجھے یقین ہے کہ نصراللہ کے خلاف مسعود نے ضرور بات کی ہوگی۔ کیوں کہ ان کی فطرت ہی کچھ ایسی تھی۔

ہوٹل ہیڈرائن، جہاں ہمارا قیام تھا، کے عین ساتھ، ایک خالی قطعہ اراضی ہے۔ ہوٹل کے ساتھ ایک سڑک ہے۔ اور اس کی دُوسری جانب ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ ساتھ والے خالی قطعۂ اراضی کے درمیان، ایک یادگار ایستادہ ہے۔ یہ اُن سپاہیوں کی یادگار ہے جو جاپان کے خلاف جنگ میں یہاں کام آئے۔ ان سپاہیوں کی رجمنٹوں کے نام بھی اس یادگار پر رقم ہیں۔ دُوسری جنگِ عظیم کے دوران اس جگہ رائل انڈین آرمی نے جاپانی طوفان کا مقابلہ کیا تھا۔ لیکن، سخت مقابلے کے بعد اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ تاہم جو لوگ یہاں ہلاک ہُوئے۔ ان میں اپنے ملک کے بھی بہت سے افراد ہُوتے ہوں گے۔ رائل انڈین آرمی کے لیے بھی انہی علاقوں سے فوج بھرتی کی جاتی تھی۔ جن سے آج ہم کرتے ہیں۔۔

راولپنڈی ڈویژن سے ہی سپاہی لیے جاتے تھے۔

مَیں نے یادگار کے قریب کھڑے ہو کر سوچا کہ، غربت اور غلامی کی زنجیریں ہاتھ میں پہنے، جانے کیسے کیسے جوان رعنا، وطن سے ہزاروں میل دُور، اس جگہ بارُود میں جُھلس گئے ہوں گے۔ ان کی ماؤں کی منتظر آنکھیں، ان جوانوں کی راہ دیکھتے دیکھتے قبر کے دہانے پہنچ گئی ہوں گی۔ ان کے بچوں نے پھر کبھی ان کا مُنہ نہ دیکھا ہو گا۔ محض پیٹ کی آگ بھرنے کے لیے۔ انھیں انگریز کی بھڑکائی ہوئی چِتا میں کُودنا پڑا۔ ورنہ وہ تو انگریز کے غلام تھے مگر انھیں انگریز کو بچانے کے لیے لڑنا پڑا۔ اور آج! وطن سے دُور ان کی گُم نام یادگاریں ہیں۔ جہاں کوئی نہیں جانتا، وہ کون تھے۔ کیوں یہاں آئے تھے۔ اور کس کے لیے لڑے مرے تھے۔

.... ہم ان ہی بے کس و بے نوا لوگوں کے وارث ہیں۔ آج ہم آزاد ہیں۔ مگر آزادی کے معنوں سے ہنوز نا آشنا ہیں۔ نتیجۃً صرف تیس برس میں اپنا آدھا ملک گنوا بیٹھے ہیں۔ ہمارے افسر، حکمران، سیاست دان اور خسروانِ وقت چاہتے ہی نہ تھے کہ آزادی کی محبوس فضاؤں سے باہر آئیں۔ خوابِ گراں سے بیدار ہوں۔ افلاس کے اندھیروں سے نجات پائیں یا شعور کی روشنی سے فیض یاب ہوں۔ چنانچہ جب کبھی ہم نے کروٹ لی، ایران شہر نے اُسی لمحے پھر تھپک تھپک کر سلا دیا۔ پھر افیون کا انجکشن لگا دیا.... بھٹو کا سب سے بڑا اعزاز، اور احسان ہی یہ ہے کہ آج ہم نے پہلی بار ہوش کی آنکھ لی ہے۔ صدیوں کے گہرے غاروں سے باہر آئے ہیں.... مگر ابھی تو منزل کی جانب سفر بھی شروع نہیں ہُوا۔

میں نے ہوٹل کے قریب اِک دکان سے پھول خریدے — اور اپنے گم نام، ہم وطنوں کی اس یادگار کے قدموں میں بکھیر دیے۔ مَیں نے زیرِ لب کہا۔ مرنے والو! تم غلامی کا شکار ہوئے تھے۔ پر ہم ایک ایسا نظامِ حیات مرتب کریں گے، جہاں تمھاری اولاد کسی آقا کی غلام نہ ہو گی۔ جنھیں چند ٹکڑوں کے لیے اپنی زندگی قربان نہ کرنی پڑے گی۔ ہم نے انگریز سے نجات پالی ہے

اب اس کے دیے ہوئے نظام کو ختم کرنے کی جدوجہد شروع ہے، تاکہ ـــ تمہاری دھرتی پر انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہ سکے . . . . .

۲۱ مئی کی صبح نو بجے ہانگ کانگ سے روانہ ہوئے۔ ہماری منزل شمالی کوریا تھی۔ جہاز جب فضا میں بلند ہوا، تو گہرے سیاہ بادل اسے اٹھا اٹھا کر یوں پھینکتے، جیسے کٹی ہوئی پتنگ ہوا میں جھولتی اور تھپیڑے کھاتی ہو۔ بادلوں کی چادر زلفِ یار سے بھی کچھ سوا ہی سیاہ تھی۔ یہ مون سون کے بادلوں کا پہلا قافلہ تھا، جو ہمارے وطن کی جانب سفر پہ نکلا تھا۔ ہم نے ان گھٹاؤں کو اپنائیت کے احساس سے دیکھا، کہ ان کے دم سے ہی اپنے غریب کسان کے چہرے پر زندگی کے آثار ہیں۔

پیانگ یانگ ائرپورٹ پر صدر کم، وزیراعظم بھٹو کا استقبال کر رہے ہیں

مُون سُون کے بادل، ہمارے یہاں پہنچنے تک تو خاصے ہلکے ہو جاتے ہیں۔ ان کی شدت دیکھنی ہو تو ـــ پھر اُس جگہ دیکھیے جہاں سے یہ چلتے ہیں۔ اتنے گھنے، سیاہ اور طاقت ور کہ خُدا کی پناہ!

کوئی تین چار گھنٹے کی مُسلسل پرواز کے بعد، جہاز نے پیانگ یانگ کے ہوائی مُستقر کو چھوا۔ نیچے تو اک دُنیا ہی اور تھی۔ ہر چار جانب، انسانوں کا سیلاب، سُرخ پھریروں کا ہوا کے دوش پر رقص۔ "مانسے ـ مانسے" (زندہ باد ـ زندہ باد) کے مُترنّم اور موسیقیت سے بھرپُور نعروں سے فضا میں ارتعاش۔ ہر جانب پھولوں کی برسات۔ حسین بچوں کے چہروں سے شفق کی مانند پھوٹتی لالی۔ محنت کشوں کے چمکتے جسم، عظمت کے نشان۔ ماؤں، بہنوں کی آنکھوں سے جھلکتا وقار۔ والہانہ پیار، خلوص اور عقیدت کا منظر۔ ایئرپورٹ کی بلڈنگ پر، دُنیا کے عظیم انقلابیوں کی تصاویر۔ الغرض نئے، لوگ، نئی تہذیب اور نئی زندگی کا نقشہ ہمارے سامنے تھا اور ہمیں شرمسار کرنے کو کافی تھا۔

پھر مارچ پاسٹ کی تقریب کا آغاز ہُوا۔ کوریا والوں نے اپنے کسی انقلابی ترانے کی لَے پر مارچ پاسٹ کیا۔ اس ترانے میں اتنا سوز اور اتنی بغاوت ہے کہ محض، سُروں کا جادُو، ہم ایسے واردانِ چین، کو مسحور کرنے کے لیے کافی تھا۔ آپ کو کبھی موقع ملے تو شمالی کوریا کا قومی ترانہ ضرور سُنیے گا۔

عظیم افواجِ آزادی کے دستوں نے جب مارچ پاسٹ کیا۔ تو کوریا کی بہادر بیٹیاں اپنے کندھوں پہ بندوقیں سنبھالے، فوجی وردی میں ملبوس، بدن پر اسلحہ سجائے، اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ مارچ کرتے گزریں۔ کسی کے ناخن طویل تھے، نہ چہرے پر پاؤڈر یا غازہ تھا۔ ہونٹوں پر لپ سٹک تھی، نہ تنگ و تاریک لباس ـــ نہ چلتے وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ عورت کی چال ہے۔ مگر اُن کے پاس فطرت کا حُسن، ـــ اور انسانیت کا وقار تھا۔ اپنے ہاں جس عمر میں لوگ، ہیر اور رانجھا بنتے۔ یا رومیو، جولیٹ کا فسانہ دُہراتے

کی کوشش کرتے ہیں، یہ اس عمر کی لڑکیاں تھیں ـــــ مگر مرد کے شانے سے شانہ ملائے، اپنی قوم کے لیے بندوق سنبھالے، پورے اعتماد کے ساتھ، راہِ حیات پر گامزن تھیں۔ کیونکہ کوریا میں رومیو جولیٹ کا نظام بدل چکا تھا۔ اس لیے عورت کی ذات میں بھی تغیر تھا۔ ورنہ اسی کوریا کا جنوبی حصہ، جہاں امریکہ نواز، رجعت پسند حکومت قائم ہے اگر آپ داخل ہوں تو، ایئرپورٹ ہی پر آپ کو قحبہ خانوں کے ایڈریس ملیں گے تاکہ آپ کو زحمت نہ اٹھانی پڑے ـــــ مگر سوشلسٹ نظام نے شمالی کوریا کی زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ اور اس نئی زندگی کا پہلا تاثر ہی اتنا بھرپور، اتنا جاندار، اور اتنا حقیقی تھا کہ ہم تو ہم؟ ـــــ بہت سوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ حتیٰ کہ مسعود محمود جیسے افسر جن کے ذہن میں افسری کا خناس سوتے وقت بھی دستک دیتا رہتا ہے۔ یہاں کنوتیاں گرا کر کھڑے نظر آتے۔

ایئرپورٹ سے ریسٹ ہاؤس تک کوئی ۴۰ کلومیٹر راستہ تھا۔ مگر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کسانوں، مزدوروں، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی رقص کرتی ٹولیاں۔ لاکھوں انسان جمع ہیں۔ مگر لائن بنا کر کھڑے ہیں۔ کیا مجال جو ذرا بھر بھی ادھر سے اُدھر ہو جائیں۔ ہر ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ ہے۔ بائیں ہاتھ میں پھول ہیں۔ اور دایاں خالی ہے۔ آپ اپنی پوری کوشش کر دیکھیے آپ کو کوئی بچہ، بوڑھا، عورت یا مرد ایسا نظر نہ آئے گا، جس نے دائیں ہاتھ میں پھول تھام رکھے ہوں۔ بظاہر یہ بہت معمولی اور ناقابلِ توجہ باتیں ہیں، لیکن اگر کوئی غور کرے تو، یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی کسی قوم کے مزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔

راستے میں مختلف جگہوں پر پاکستانی ریکارڈ بج رہے ہیں۔ ایک جگہ مادام نورجہاں کا یہ نغمہ بھی گونجتا سنائی دیا:

" سیونی میرا ماہی، مینوں بھیر بناون آگیا "

کوریا والوں کو ان الفاظ کے معانی سے کیا شدھ بدھ ہو گی، تاہم، ہم نے اس سے خوب لطف لیا۔ نور محمد، مغل، جو وزیراعظم کا ذاتی خدمت گار ہے۔ اُس نے لہرا لہرا کر سب کو

اس جانب متوجہ کیا۔ بس پھر کیا تھا بعد میں جہاں کسی سے ملتا پہلی بات یہی کہتا "دیکھا تم نے۔ میڈیم نورجہاں کا ریکارڈ یہاں بھی بج رہا تھا۔" نور محمد ہمہ وقت میڈیم کی تعریف کرتا رہتا ہے۔ اور پھر یہ واقعہ "جلتی پہ تیل" کا کام کر گیا۔ غالباً اسے میڈیم کی آواز بہت پسند ہے۔

کوریا والوں نے بھٹو کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے۔ اور کیوں نہ کرتے۔ کہ، فاصلوں کی دوری کے باوجود۔۔۔ دلوں میں قربت موجود تھی۔ دونوں جانب سامراج دشمنی کا گہرا تعلق تھا اور عوام دوستی کا اٹوٹ رشتہ قائم تھا۔

کوریا میں ایک ضیافت کے دوران۔ صدر کم اور بیگم کم، وزیر اعظم بھٹو اور مسز بھٹو کے ساتھ

اسی شام صدر کم ال سنگ نے پاکستانی وفد کے اعزاز میں ضیافت دی اور ہم لوگ جانے کے لیے تیار ہو کر لان میں کھڑے تھے۔ وفاقی وزیر زراعت شیخ محمد رشید اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں مجھے کہنے لگے،

"پتر، ایہہ ہوندا اے سوشلزم۔ اے بس۔ ایہو آوے تاں ...." ابھی وہ بات کر ہی تھے کہ بھٹو صاحب اپنے کمرے سے اترے۔ شیخ صاحب کو اور ہمیں کھڑے دیکھا اور

مسکرا کر کہا:

"کیوں شیخ صاحب! پھر دیکھا آپ نے۔ کیا خیال ہے؟" ان کا اشارہ صبح کے استقبال اور کوریا کے نظامِ حیات کی جانب تھا۔

شیخ رشید نے کہا: "جی ہاں! بہت اعلیٰ ہے جناب"

جناب بھٹو نے پلٹ کر میری جانب دیکھا اور پوچھا: "کیا کہتے ہو؟" میں نے عرض کیا۔

"سر! ہم تو پہلے سے ہی قائل اور تیار بیٹھے ہیں۔" بھٹو صاحب نے کہا "آئے گا ضرور آئے گا سوشلزم لائیں گے۔"

کوریا والوں نے اپنی ضیافت میں پاکستانی کھانوں کا بھی اہتمام کیا تھا، اور کوریائی کھانوں کا بھی بندوبست تھا۔ میرے ساتھ کوریا کی ورکرز پارٹی کے ایک اہم عہدے دار تشریف رکھتے تھے۔ دورانِ طعام ان سے کوریا کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی انھوں نے کوریائی عوام کی جنگِ آزادی کے بہت سے ایمان افروز واقعات سنائے۔ ان صاحب نے جنگ آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ ان کے چہرے اور بائیں ہاتھ پر جنگ کے مستقل نشان زخم کی صورت میں ثبت تھے۔

صدر کم نے اپنی تقریر میں جناب بھٹو کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ تیسری دنیا کی آزادی کی بات کی۔ کوریا کی ازسرِنو یکجائیت کا مسئلہ اٹھایا، اور سامراجی قوتوں پر تبصرہ کرتے رہے۔ جناب بھٹو نے جوابی تقریر میں؛ جنوب مشرقی ایشیا کی سیاست پر بڑی مدلل تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ تیسری دنیا کے مظلوم عوام زندہ رہنے کا حق مانگتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہماری جنگ غربت اور افلاس کے خلاف ہے۔ قومی آزادی کی جدوجہد انقلابی جدوجہد ہے، اور پاکستان ان ممالک کے شانہ بشانہ چلے گا۔ انھوں نے کہا کہ کوریا ایک عظیم اور قدیم قوم ہے۔ موجودہ تقسیم کو ختم کیا جانا چاہیے۔ تاکہ کوریا ایک ہو سکے۔

ضیافت کے دوران ہی کوریا کے موسیقاروں نے ساز پر ہماری لوک دھنیں بجائی

شروع کیں۔ سب سے پہلے۔ لال شہباز قلندر ایسی مستی میں ڈوبی دُھن پر لوگ جھُوم جھُوم اُٹھے۔ دو چار لوک دُھنیں بجانے کے بعد انھوں نے یہ ترانا گایا۔

" سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے "

اس ترانے پر جوش کی ایسی کیفیت پیدا ہُوئی کہ پاکستانی وفد کے اراکین کھڑے ہو کر تالیاں بجانا شروع ہو گئے۔ جناب بھٹو اس ترانے کو از حد پسند کرتے ہیں۔ سو وہ نہ صرف کھڑے ہُوئے۔ بلکہ اپنے ساتھیوں کو لے کر سٹیج پر چلے گئے۔ اور اس طرح۔ ہال میں موجود پاکستانی وفد نے کوریائی موسیقاروں کے ساتھ مل کر اس ترانے کو دو بار گایا۔ اور یوں جوش و خروش سے بھرپور محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

بچّے

اپنے یہاں کی تو خیر بات ہی اور ہے۔ یہاں بچے پیدا کرنا کارِ ثواب ہے اور ان کی تربیت سے چشم پوشی اپنی روایت۔ بے چارے دھڑا دھڑ پیدا ہوتے ہیں کچھ تو ساگ پات کھا کر زندہ رہ لیتے ہیں لیکن جنھیں مرنا ہو۔ آزادی سے مر بھی سکتے ہیں۔ یہ معاملات ہم نے خُدا کے سپرد کر رکھے ہیں۔ لہٰذا بہتر چل رہا ہے۔ بلکہ بخوبی چل رہا ہے۔ فکر سے فائدہ ؟

بچّوں کو ہم انسان کے بچے نہیں سمجھتے۔ خیر بچوں ہی کا کیا مذکور' انسان کا بچہ تو ہم بڑوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ لہٰذا اپنے وطن کے بچے بے چارے' گلیوں سڑکوں اور محلّوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ گھر میں گھُسے تو باپ کی جُوتیاں' ماں کی پھٹکاریں' نہ پوری خوراک' نہ توجہ' نہ پیار' نہ تربیت۔ سَو میں دس پندرہ خوش نصیب ـــ بمشکل سکول کا منہ دیکھ پاتے ہیں۔ اور صرف منہ ہی دیکھ پاتے کہ اگر سکول ہے تو عمارت سے بے نیاز۔ عمارت ہے' تو کُرسی میز غائب۔ اور اگر اتفاق سے سب کچھ ہے تو پھر حضرتِ استاد کاہے کو دستیاب ہوں گے۔ ذہنی پرورش کا کوئی اہتمام نہ جسمانی ورزش کا کوئی اہتمام۔ سکول تو ٹھہرے سکول۔ کسی یونیورسٹی میں جا دیکھیے۔ کسی نوجوان سے پُوچھ لیجیے " آپ ہسٹری میں ایم۔ اے کیوں کرنا چاہتے ہیں " سو

فی صد جواب ملے گا" جغرافیے میں داخلہ مل سکتا تھا؟

اگر آپ کو لفظ تعلیم پر اعتراض نہ ہو تو کہنے دیجیے کہ اس افراتفری کے ماحول میں جو بچے تعلیم پا کر باہر نکلیں گے۔ ان کا ذہنی صدود اربعہ کتنا وسیع ہو سکے گا؟ کیا عمر بھر وہ اپنے ناک سے پرے بھی دیکھ پائیں گے؟ سو جناب اپنے اس علم سے مراد ایسا فن حاصل کرنا ہے جس کے بل بوتے پر بڑے سے بڑا عہدہ مل سکے۔ یا زیادہ سے زیادہ رشوت حاصل کر سکیں۔ اور اپنی ذات کی افزائش کر سکیں۔ کار، کوٹھی اور بنگلہ بنا سکیں۔ بیگم صاحبہ کے لیے نت نئے فیشن مہیا کر سکیں۔

کوریا - "بچوں کے محل" میں وزیر اعظم بھٹو

کوریا میں نقشہ اس کے اُلٹ پایا۔ سب کچھ ہی اپنے ہاں سے برعکس ہے۔ ۲۲ مئی کی صبح ہمیں "بچوں کے محل" میں لے جایا گیا۔ یہ بچوں کا ٹیکنیکل سکول ہے۔ تقریباً ۱۲ ہزار کے لگ بھگ بچیاں اور بچے اس ادارے میں زیر تعلیم ہیں۔ جی ہاں کوریا میں بچوں کو ابتدائے عمر سے فنی تربیت دی جاتی ہے۔ کوریا میں سب سے زیادہ زور، نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر دیا جاتا ہے۔ پانچ برس سے لے کر پندرہ برس تک کے بچے بچیاں موجود تھے۔

اب ذرا پڑھانے کا انداز سنیے۔ ہر کلاس روم میں اُستاد کی میز پر پیانو موجود۔ بلکہ میز ہی

میں موجود۔ لیکچر شروع ہونے سے قبل استاد پیانو پر کوئی جوشیلا ترانہ چھیڑے گا، اور پوری کلاس اس کی ہمنوا ہوگی۔ یہ ترانے محض رسمی کارروائی نہیں ہوتے جیسے ہمارے ہاں سینما ہال میں ہوا کرتی ہے۔ بلکہ کوریا والے جانتے ہیں کہ بچوں کے ذہن میں اجتماعی زندگی کا جذبہ دھرتی ماں سے پیار اور انقلابی عقائد راسخ ہو جائیں۔ اس کے لیے وہ بچپن ہی سے پُورا اہتمام کرتے ہیں۔

ان ہزاروں بچوں میں ہم ۸۰ تا ۹۰ پاکستانی گھومتے پھرے۔ مگر کیا مجال جو کسی بچے کا چہرہ حیرت یا استعجاب کا نشان بنا ہو، کوئی ڈرا یا جھجکا ہو، کوئی شرمایا ہو، کسی نے کنکھیوں سے دیکھا ہو، کہیں ہلڑ بازی یا بھگدڑ مچی ہو۔ سارے بچے پُورے سکون اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے مطالعہ میں منہمک نظر آئے۔ بلکہ نئی دنیا کے ان عظیم بچوں نے قدم قدم پر ہمیں اپنے برتاؤ سے حیرت زدہ کیے رکھا۔

جس کمرے میں یا کلاس روم میں داخل ہوتے۔ بچے ہمارا ہی کوئی ترانہ یا کوئی مشہور لوک گیت کمل لَے میں پیش کرتے۔ وہ خود ہی ساز بجاتے۔ گائیکی کے زیر و بم کے سارے پہلو سامنے لاتے۔ تلفظ مبالغے کی حد تک درست اور ساز و آواز پہ ناقابلِ بیان حد تک عبور۔ "لال شہباز قلندر" سے لے کر "سوہنی دھرتی" تک ہر ترانہ اور لوک گیت سُنایا گیا۔ ہم نے حساب کیا، تو کوئی تیس کے لگ بھگ گیت اور ترانے ہمیں سنائے گئے۔ کوریا والوں کی "دست بُرد" سے اگر کچھ بچ سکا۔ تو وہ اپنے بھا عنایت بھٹی ہوراں دا "اصلی تے خالص دھر گرما" ہی بچ سکا۔ ورنہ باقی سب کچھ تو انھوں نے ہمیں سنا دیا۔ کوریا میں متعین پاکستانی سفیر، انور سعید صاحب نے بتایا کہ کوریائی بچوں نے یہ سارے گیت اور ترانے صرف دس دنوں میں تیار کیے ہیں۔

بچے اس سکول میں نہ صرف عام تعلیم حاصل کرتے ہیں بلکہ ابتدائی جماعتوں ہی سے انھیں ٹیکنیکل تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ بچوں کے وائرلیس آپریٹنگ کا کام سیکھتے دیکھا۔ ہمیں وہ موٹر

ٹرنکیز، ریڈیو، بجلی اور اس قبیل کے دُوسرے ٹیکنیکل کاموں سے عملی طور پر آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ علم طب اور سائنس کی تربیت بھی بچپن ہی سے دی جاتی ہے۔ اور انتہائی وسیع پیمانے پر دی جاتی ہے تاکہ ملک کی آئندہ ترقی میں فنی تعلیم کی ضرورت کو پُورا کیا جا سکے۔ کوریا والے جانتے ہیں۔ کہ فنی تربیت اور فنی علم کے بغیر، ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ انھیں اس حقیقت کا ادراک ہے کہ آنے والا دور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ ٹیکنالوجی کے بغیر صنعت اور مشین کا تصور ہی ناممکن ہے۔ لہٰذا وہ اس میدان میں اپنی بھرپُور کوشش کر رہے ہیں۔ اور اپنی ترقی کی منزلوں کو ہر لحظہ قریب تر پا رہے ہیں۔ "بچوں کے محل" نے ہمیں بہت متاثر کیا۔

سکول نرسری کا مُعائنہ

ایک صبح ہمیں اطلاع ملی کہ آج بچوں کی ایک نرسری دکھانے جانے کا پروگرام ہے بچوں کا یہ سکول "ہفتہ وار نرسری" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کوئی تین ہزار بچے تعلیم پاتے ہیں۔ یہ سارے بچے یہیں رہتے بھی ہیں۔ ان کے لیے انتہائی خوبصورت ہاسٹل بنایا گیا ہے۔ صرف ہفتے والے دن، وہ اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں۔ جن ماؤں کے زیادہ بچے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سارے بچوں کی تربیت نہیں کرسکتیں۔ وہ اپنے ننھے منے بچوں کو اس نرسری میں یا اس جیسے کسی دوسرے سکول میں داخل کرا دیتی ہیں تاکہ بچے کی پرورش پر کوئی اثر نہ پڑے۔ اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس ہفتہ وار نرسری کے منتظمین نے بتایا کہ بچے یہاں کی اجتماعی زندگی کو از حد پسند کرتے ہیں۔ حد یہ کہ ہفتے والے دن بھی۔ اپنی ماؤں کے ساتھ گھر جانے کی بجائے یہاں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس نرسری میں چھوٹے چھوٹے سوئمنگ پول بنے ہیں۔ ننھے منے بچے ٹیوب میں ہوا بھر کر پانی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ ننھی بچیوں کے سوئمنگ پول علیحدہ ہیں۔ ہمارے پوچھنے پر کہ اتنے چھوٹے بچوں کے سوئمنگ پول علیحدہ کیوں بنائے گئے ہیں۔ جب کہ کوریا میں جنس

کی بنیادوں پر اونچ نیچ اور تفریق موجود نہیں ہونی چاہیے۔ سکول کے ڈائریکٹر نے بتایا۔ کہ پہلے بچیوں اور بچوں کا ایک ہی پول تھا۔ ایک بار صدر کم ال سنگ تشریف لائے۔ انھوں نے کہا۔ کہ بچے جب نہاتے ہیں، تو اکثر پانی کے چھینٹے، ایک دوسرے کے منہ پر مارتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ اس طرح ننھی بچیاں پورے طریقے سے نہا نہ پاتی ہوں۔ کیوں کہ لڑکے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔ جبکہ بچیاں مقابلتاً [illegible] ہوتی ہیں۔ کامریڈ کم ال سنگ نے ہمیں ہدایت دی کہ بچیوں کی سہولت کے لیے علیحدہ سوئمنگ پول کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ نرسری میں کھیل کود کے لیے ہر قسم کے کھلونے موجود ہیں۔ لیکن یہ کھلونے سب کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ اور باری باری سبھی کھیلتے ہیں۔ ہال کے اندر بجلی سے چلنے والی ٹرین موجود ہے۔ بچے اس میں بیٹھ کر "میدان جنگ کی جانب مارچ کرتے ہیں۔ بجلی کے ذریعے چھت کے ساتھ چلتا ہوا "دشمن" کا ہوائی جہاز بھی ہے اور اس پر چلانے کو "مشین گن"۔ ایک متحرک "راکٹ" بھی موجود ہے جس پر بیٹھ کر تسخیر کائنات کا عزم . . . اور یہ سب کچھ کھیل کھیل میں سکھایا جاتا ہے۔ سکول کی منتظم ایک ادھیڑ عمر خاتون ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بچے کھلونوں کے لیے کبھی ایک دوسرے سے نہیں لڑتے۔ جس طرح اس نرسری کو سب "اپنا" سمجھتے ہیں۔ اسی طرح کھلونوں کو بھی سب کی ملکیت سمجھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ "ہم جو یہ دلیل دیتے ہیں" کہ انسان پیدائشی طور پر ہی خود غرض ہوتا ہے"۔ یہ دلیل کتنی ناقص اور بودی ہے۔ انسان کی ساری نفسیات اس کے ماحول سے مرتب ہوتی ہے۔ ایک خود غرض سوسائٹی میں وہ خود غرضی کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ ایک بے غرض اور اجتماعی سوسائٹی میں وہ اجتماعی نکتہ نظر اپنا لیتا ہے۔ ہمارے ایسے ممالک کے بہت سے دانشور "ہمیشہ سے یہ دلیل دیتے چلے آئے ہیں" نجی ملکیت انسان کا پیدائشی خاصہ ہے اور خود غرضی اس کی سرشت میں شامل ہے۔ لہٰذا سوشلزم انسانی فطرت کے خلاف، ناکام جدوجہد کا نام ہے"۔ تاہم سوشلسٹ ممالک کے تجربات نے ان منکرین کے سارے مفروضات کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ انسان بنیادی طور پر خود غرض ہے اور نہ نجی جائیداد کا تصور،

اس کی جسمانی اور فطری ساخت کے اندر پوشیدہ ہے۔ سوشلسٹ ممالک کے بچے ہوں یا بوڑھے، اُن کے نزدیک 'نجی ملکیت' کا کوئی تصور نہیں۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ نجی ملکیت کا تصور 'فطری' نہیں بلکہ سماجی ہے۔ اور خود غرضی' سماجی نفسیات کی پیدا کردہ ہے۔ جس طرح کا سماج ہوگا، افراد کی نفسیات کے عمومی زاویے اسی نہج پر مرتب ہوں گے۔ اگر 'مساوات' انسانی عظمت' اور اجتماعی ملکیت کے اصولوں پر کوئی سماج قائم ہوگا۔ تو اس میں موجود افراد' کی نفسیات بھی ان ہی خطوط پر مرتب ہوگی۔ اس فرق کا اندازہ آپ اس معمولی سی بات سے لگا سکتے ہیں۔

ہمارے گھروں میں اگر دو بچے ہوں' تو بھی کھلونوں پر باہم دست و گریبان ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے لیے' ایک سے اور علیحدہ علیحدہ کھلونے خریدنا پڑتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے کھلونوں پر بزور قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (جبکہ سوشلسٹ نظام کے تین ہزار بچے مشترکہ کھلونوں سے کھیلتے ہیں) چونکہ ہمارا سماج خود غرضانہ نجی ملکیت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس لیے' ہمارے بچوں کی نفسیات بھی اسی حساب سے پرورش پاتی ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ پورے کوریا کے سکولوں کے ہر کلاس روم میں' کوریا کی تصویری تاریخ آویزاں ہے۔ قدیم کوریا کی تصویریں۔ بادشاہت کے دور کی تصویریں۔ جاپان کے دور کی تصویریں۔ جنگ آزادی کی تصویریں۔ کم ال سنگ کی قیادت میں آدھے کوریا کی آزادی کے مناظر۔ پھر سامراجی حملے کی تصویریں جو ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ اور آخر میں یہ عزم کہ آدھا کوریا آج بھی غلام ہے۔ سامراج کے زیرِ قبضہ ہے۔ ہم بڑے ہو کر۔ جنوبی کوریا بھی آزاد کرائیں گے۔ مصنوعی حد بندی ختم ہو جائے گی۔ پھر ہمارے بچے اکٹھے پتنگ اڑائیں گے۔ سوشلسٹ اور عظیم کوریا میں امن، ترقی اور خوش حالی' کے گیت سُنیں گے۔

نرسری کے بچے' پانچ' چار سال کی عمر سے کیا زائد ہوں گے۔ نگران کا رویہ اور برتاؤ، بڑوں سے کم نہ تھا۔ مس جب ان سے کوئی سوال پوچھتی' وہ تصویروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی تتلی زبان میں جواب دیتے۔ جب صدر کم ال سنگ کی تصویر پر پہنچتے تو ذرا سا مودب ہو کر

اپنی گردن کو خم دیتے۔ تاہم ہم ۸۰ یا ۹۰ غیر ملکی مہمان تھے۔ اور پانچ سال کے بچے، ہمارے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔ جب کہ ہمارے یہاں جب کبھی بچوں کو ایئرپورٹ لے جایا جاتا ہے تاکہ غیر ملکی مہمانوں کی آمد پر انہیں پھولوں کا گلدستہ پیش کر سکیں۔ تو ایک تماشا بن جاتا ہے۔ کبھی دائیں کی بجائے بایاں ہاتھ آگے کرتے ہیں کبھی شرما کر پیچھے ہٹتے ہیں۔ لہذا بعض اوقات انہیں دھکیل دھکیل کر آگے کرنا پڑتا ہے۔

مگر یہاں نرسری کے بچوں میں اتنا اعتماد تھا، کہ کچھ نہ پوچھیے۔ جب ان کی مس نے کہا "اب آپ اٹھیے۔ اور مہمانوں کو خوش آمدید کہیے تو بچے "زندہ باد" کا نعرہ بلند کرتے ہم سے لپٹ گئے۔ اتنے صحت مند، سرخ و سفید، گول مٹول، ننھے منے فرشتے، جنہیں دیکھ کر بے اختیار چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ مگر کوریا میں بچے بوسہ دیتے ہیں نہ لیتے ہیں۔ صرف اپنے دو ہاتھ آپ کے گالوں پر پیار سے رکھ دیں گے، آپ سے لپٹ جائیں گے ۔۔۔ اور آپ سے یوں گھل مل جائیں گے جیسے آپ کے اپنے بچے ہوں۔ کوریا میں بچوں کا ایک مشہور گیت ہے۔

ہمارے ملک میں اب بادشاہ نہیں ہوتے

لیکن ہمارے بچے ہمارے بادشاہ ہیں

اور یہ سچ ہے کہ کوریا میں بچوں کو پھول کی مانند رکھا جاتا ہے۔ انہیں بہترین لباس مہیا کیا جاتا ہے۔ تعلیم، کتابیں، کپڑے الغرض ہر چیز حکومت کی ذمہ داری ہے۔ پورے ملک میں ایک سا نظام تعلیم مروج ہے۔ کوریا کے محنت کشوں کے بچے، کل کے کوریا کے نگہبان ہوں گے۔ ان ہی کے ذہن رسا سے یہ چمن اور مہکے گا۔ عظمت کے پھول ہر جانب کھلیں گے۔ انفرادیت پسندی، ذاتی ملکیت، اور انا پرستی کے بیمار نظریات، یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کیے جا چکے ہیں۔ چنانچہ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوریا میں جنم لینے والا ہر بچہ صرف اپنے ماں باپ

کی اولاد ہی تصور نہیں ہوتا، بلکہ پورے معاشرے کا بچہ سمجھا جاتا ہے۔ کوریا میں علم کا تناسب سو فی صد ہے۔ شہر، قصبے اور گاؤں میں بچوں کے لیے بہترین سکول اور کالج بنائے گئے ہیں۔ بچے تو خیر ٹھہرے بچے۔ کوریا والے تعلیم کے سلسلے میں بڑوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ کوریا میں بسنے والے ہر فرد، خواہ وہ کوآپریٹو میں کام کرتا ہے۔ یا فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ فوج میں ملازم ہے۔ الغرض کوریا کے کسی بھی کونے میں موجود ہے۔ اُسے ہر روز لازمی طور پر ایک گھنٹہ پڑھنا پڑے گا۔ اور یہ نہیں کہ گھر لیٹے لیٹے پڑھ لے۔ بلکہ یہ تعلیم اجتماعی صورت میں لینا ہوگی۔ تعلیم کسی پر معاف نہیں۔ کسی حالت اور کسی عہدے پر معاف نہیں۔ کسی عمر اور کسی پیشے میں معاف نہیں۔

ہم وقت کی کمی کے باعث کم اِل سنگ یونیورسٹی پیانگ یانگ نہ جا سکے۔ میں نے خصوصی طور پر وہاں جانے کی اجازت بھی لینا چاہی، مگر میری خواہش پروٹوکول کے تکلفات کا شکار ہو گئی۔ جس دن اجازت نامہ آیا، وہ دن فارغ نہ تھا۔ لہٰذا یونیورسٹی دیکھنے کی خواہش کو وقت کی کمی کے باعث قربان کرنا پڑا۔ کوریا والوں کا اس میں قصور نہ تھا۔ دراصل اپنے دفتر خارجہ والوں نے چابکدستی کا مظاہرہ کیا تھا! یوں مجھے اس مشہور دانش گاہ کو اک نظر دیکھنے کی آرزو سے محروم ہونا پڑا۔

" اکنامک انسٹی ٹیوٹ "

تاہم ایک شام "اکنامک انسٹیٹیوٹ" میں جانے کا غلغلہ بلند ہوا۔ ہم نے سوچا کوئی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹائپ جگہ ہوگی۔ دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے؟ انسٹی ٹیوٹ میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ "طلبا" ہمارے بزرگوں کی عمر سے بھی کچھ بڑے ہی ہوں گے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر خود بھی ان طلبا کے مقابلے میں ہنوز طفلِ مکتب نظر آتے تھے۔ ہم نے دل ہی دل میں سوچا، کوریا والے بھی ایک استاد ہیں۔ "بزرگوں" کو پڑھاتے ہیں۔ ہمیں دکھاتے ہیں۔ اور شرمندہ کرتے ہیں۔

تو جی اس انسٹی ٹیوٹ میں زیرِ تعلیم طلبا نہ صرف عمر کے لحاظ سے بڑے لوگ تھے بلکہ ایسے

بھی نامی گرامی اور اہم ترین لوگ تھے۔ اس ادارے میں ورکرز پارٹی کے اعلیٰ عہدے دار، سنٹرل کمیٹی کے اراکین، وزیرِ کبیر اور عوامی فوجِ آزادی کے جرنیل پلتے ہیں۔ یہ بہتر طور پر یوں کہہ لیجیے کہ یہاں ریفریشر کورس کرتے ہیں۔

یہ تعلیم دراصل ایک قسم کا نظریاتی غسل ہے۔ جو ان ذمہ دار اور پالیسی ساز افراد کو ہر سال کرایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ کورس لازمی ہے۔ اس تربیت گاہ میں "طلبا" دو سے لے کر چار ماہ تک رہتے ہیں۔ یہاں انھیں عام محنت کش کی سی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔ کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ اپنے کپڑے خود دھوتے ہیں۔ بستر خود صاف کرتے ہیں۔ کمرے میں جھاڑو چلاتے ہیں۔ میدان سے گھاس کاٹتے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا کہ چند بزرگ نیکریں پہنے، پسینے میں تربتر، گھاس کاٹنے کی مشین کھینچ رہے ہیں۔ ڈائریکٹر نے بتایا: "وہ صاحب جو گرد اور مٹی میں دُھول پہنے مشین چلا رہے ہیں ہماری فوجِ آزادی کے نامور جرنیل ہیں۔ ان کے ساتھ پارٹی کے انتہائی اہم عہدیدار بھی اس کارِ محنت میں شریک ہیں۔" لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اسی عمارت کے ایک کونے میں نائب وزیرِ تعلیم بھی نظر آئے۔ مگر حالت یہ تھی کہ جھاڑن ہاتھ میں تھا، اور کمروں کی کھڑکیاں صاف کرتے پھر رہے تھے۔ وہ بھی اس وقت یہاں "طالبِ علم" تھے۔

آخر کار ہمیں ایک بڑے ہال میں پہنچایا گیا۔ جہاں سارے "طلبا" بھی بلائے گئے۔ اور تعارف کے بعد سوال و جواب کی نشست شروع ہوئی۔ لیکن طلبا محض "طلبا" ہی تھے۔ جب تک ڈائریکٹر کسی کو اشارہ نہ دیتے وہ بولنے سے گریز ہی کرتے۔ یہاں ان کا کوئی عہدہ تھا، نہ ناز نخرہ۔ یوں سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے بے چارے کبھی کچھ تھے ہی نہیں۔

ڈائریکٹر صاحب نے بتایا "یہ بہت اہم ادارہ ہے۔ یہاں ہر اُس شخص کو آنا پڑتا ہے جو کسی اہم عہدے پر فائز ہو۔ ہماری پارٹی درست لائن صرف اسی صورت دے سکتی ہے جب اس کے رہنماؤں کے نظریات درست ہوں۔ نظریات کو مسلسل عمل میں درست رکھا جا سکتا ہے۔ یہ یہ صرف پڑھنے پڑھانے سے نہیں آتے۔ بلکہ عمل اور تجربے سے درست ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی

شخص خواہ کتنا ہی صحت مند کیوں نہ ہو اگر اپنا ہاتھ منہ ایک سال تک نہ دھوئے۔ تو اس کے جسم پر گند کے اثرات پیدا ہو جائیں گے۔ جوں جوں وقت گزرے گا یہ مرض بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس طرح ایک وقت ایسا بھی آ جائے گا کہ اس کا جسم پھوڑوں سے بھر جائے گا۔ اس کے زخم رِسنا شروع ہو جائیں گے۔ تب نہ صرف مذکورہ شخص کی زندگی خطرے میں ہوگی۔ بلکہ وہ اپنے وجود کے بیماری جراثیم دوسروں میں بھی پھیلاتا رہے گا۔ اور اس طرح دوسروں کو بھی بیمار کرے گا۔ بالکل اسی طرح اگر نظریات کی طہارت نہ ہو۔ انھیں درست نہ رکھا جائے۔ تو نظریاتی کوڑھ کی بیماری پھیل سکتی ہے۔ نظریات بھی بڑھتے پھیلتے رہتے ہیں۔ وہ بیمار ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ مگر نظریاتی بیماری کا نتیجہ پوری قوم کی تباہی کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ طہارت و پاکیزگی کی علامت ہے۔ پارٹی اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدار یہاں ہر سال ریفریشر کورس کرتے ہیں۔ یہاں نہ صرف انھیں جدید تعلیم سے آشنا کرایا جاتا ہے۔ بلکہ ان سے پوری پوری مشقت بھی لی جاتی ہے تاکہ ان میں یہ احساس بیدار رکھا جائے کہ وہ عوام سے ارفع یا اعلیٰ کوئی شے نہیں ہیں۔ اگر ان کا کوئی مقام ہے تو صرف اور صرف عوام کی وجہ سے ہے۔ عوام ہی ملک کے مالک ہیں۔ تاریخ کے خالق ہیں۔ اور ساری عظمتیں ان کے لیے ہیں۔ پارٹی کا کام عوام کی خدمت کرنا ہے۔ اگر ہم اپنی پارٹی کے نظریات درست نہ رکھیں۔ بروقت طہارت نہ کریں۔ بیماری کا علاج نہ کریں۔ نظریات کی صفائی نہ کریں۔ اپنے تجربوں سے ان کی صداقت کو نہ پرکھیں، تو عین ممکن ہے ہماری جماعت ترمیم پسندی کا شکار ہو جائے۔ کوڑھ کا شکار ہو جائے۔ تو ہم خود کو عوام سے اعلیٰ سمجھنا شروع ہو جائیں۔ انھیں اپنے سے کم تر سمجھنے لگیں گے اور انھیں ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر ہانکنا شروع ہو جائیں گے۔

جب سوال و جواب کی محفل چلی، تو ہمارے ایک دو افسروں نے اپنی ذہانت کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ انٹ شنٹ سوال پوچھنا چاہے۔ پیرزادہ صاحب نے طریقے سے انھیں خاموش کرایا۔ تاہم، حالت ہم سب کی دیکھنے کے قابل تھی۔ ہمارے وفد میں وزراء بھی تھے۔ ایم این اے۔ اور

ہم پیالے بھی تھے۔ سرکاری افسر بھی موجود تھے۔ (مجسٹریٹ صاحب تشریف نہ لا سکے تھے۔ کیوں کہ صدر کم کے ساتھ ملاقات کا دوسرا راؤنڈ شروع تھا) سب کے سب حاضرین مبہوت تھے۔ سچ جانیے تو یہ مقام ہی کچھ ایسا تھا۔ جب وہاں سے واپس چلنے لگے تو سرحد والے عبدالرزاق خان نے افسروں کی اس جوڑی کو اپنے پاس بلایا۔ اور کہا ”تم گھبراؤ نہیں، پاکستان میں بھی وہ وقت ضرور آئے گا۔ جب ہم تمہاری ذہنی طہارت کا بندوبست کریں گے“.....

چلیے یہاں کوریا کی مختصر تاریخ سے بھی واقفیت حاصل کرتے چلیں۔ کوریا ایک انتہائی قدیم ملک ہے اور بڑی عظیم قوم یہاں بستی ہے۔ اس کی سرحدیں، چین اور روس دونوں سے ملتی ہیں۔ اور جاپان سے بھی نسبتاً قریب ہے۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں جاپان، ایشیائی سامراج کے رُوپ میں اُبھر رہا تھا۔ چنانچہ چین اور کوریا، جاپان کی نوآبادیاتی وُسعت کی پالیسی کا نشانہ بنے۔ بیسویں صدی کی ابتداء نوآبادیات کے نظام کی انتہا تھی۔ سامراجی ممالک، نوآبادیات قائم کرنے کی کوششوں میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی عملی کوششوں میں مصروف تھے۔ کوریا کے صلح جُو اور غریب عوام جاپان کے سامراجی تسلط کا زبردست نشانہ بنے۔ جس طرح انگریز برصغیر میں اپنے مخالفین کو توپ پر رکھ کر اُڑا دیا کرتا تھا۔ جس طرح ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے دوران اور بعد میں وحشیانہ بربریت کا دَور دورہ تھا۔ ہر مخالف کی نسل تک کو جبراً موت کے مُنہ میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ گاؤں کے گاؤں محض شک کی بنا پر منہدم کر دیے جاتے تھے۔ ہر درخت پر لٹکی ہُوئی لاشیں، عوام کو سامانِ عبرت مہیا کرتی تھیں۔ جس طرح یہاں نواب، مہاراجے اور جاگیردار، برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں حلفِ وفاداری کا دم بھرتے نہ تھکتے تھے۔ مَلکہ کا نمک خوار کہلانا، اپنے لیے باعثِ فخر جانتے تھے۔ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید طریقے سے جاپانی سامراج نے کوریائی عوام کو اپنی ہوسِ مُلک گیری کا نشانہ بنایا۔ اور اسی طرح وہاں کے نواب اور جاگیردار جاپان کی وفاداری میں پیش پیش تھے۔

تاہم آزادی کی جدوجہد بھی ساتھ ہی چلتی رہی۔ میں نے کوریا میں بعض پرانے

اخباری سائز کے جاپانی پمفلٹ دیکھے۔ جو کبھی شہروں میں لگائے گئے ہوں گے۔ ان اشتہاروں میں ایک جاپانی سپاہی ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں لالٹین لیے کھڑا ہے۔ اور عوام سے کہا گیا ہے کہ وہ اس کا استقبال کریں۔ جس طرح ہمارے ہاں انگریز خود کو ترقی، تہذیب اور روشنی کی علامت کے طور پر پیش کرتا تھا۔ بالکل اسی طرح جاپانی سپاہی کی لالٹین بھی ترقی کی علامت تھی۔ اور جو اس "ترقی" کو روکنا چاہیں، اُن کے لیے بندوق۔ تاہم کوریا میں پہلے پہل مختلف گروہ اور افراد اپنے طور پر جنگِ آزادی کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ صدر کم ال سنگ نے ان انقلابیوں سے رشتہ جوڑا۔ اور بیس سال کی مسلح جدوجہد کے بعد ۱۹۴۵ میں آدھا کوریا آزاد کرا لیا۔ جس وقت جاپان کے ساحل پر امریکی فوجیں اُتر رہی تھیں اس وقت بھی جاپان کی کئی ڈویژن فوج کوریا کے عوام کے خلاف مصروفِ کار تھی۔

امریکہ نے جاپان پر قبضہ کرنے کے بعد ساری جاپانی فوج سے ہتھیار رکھوا لیے۔ مگر جو فوج کوریا میں تھی، اس کی عملی طور پر امداد شروع کر دی۔ کیونکہ امریکہ شکست کھائے ہوئے دشمن کی کالونیوں کو اب اپنا مالِ غنیمت سمجھتا تھا۔ جنوبی کوریا میں اتحادی افواج اُتار دی گئیں تاکہ انقلابی افواج کے بڑھتے ہوئے قدم روکے جا سکیں اور بھاگتے ہوئے جاپانیوں کی مدد کی جا سکے۔

۱۹۴۶ میں صدر کم نے کوریا میں انتخابات کا اعلان کر دیا۔ ان جمہوری انتخابات میں بہت سی جماعتوں نے حصہ لیا۔ تاہم ان انتخابات کا خاص واقعہ یہ تھا کہ کوریا کے بدھ بھکشوؤں اور عیسائی پادریوں کی مذہبی جماعتوں نے آپس میں متحدہ محاذ بنایا۔ اور ایک فتویٰ جاری کیا۔ اس فتوے میں مذہب کے نام پر عوام سے اپیل کی گئی: "چونکہ ملحد اور بے دین حکومت برسرِ اقتدار ہے لہٰذا ایسی حکومت اور جماعت کو ووٹ دینا کفر ہے۔ اور حرام ہے۔" ان مذہبی جماعتوں نے امریکی سرمائے کے زور پر انتخابات کو جیتنے یا بصورتِ دیگر سبوتاژ کرنے کے متعلق زبردست مہم چلائی۔ تاہم عوام کے زندہ شعور نے انہیں بُری طرح رد کر دیا۔ صدر کم کی جماعت کو نمایاں

کامیابی حاصل ہوئی (یاد رہے کہ ۱۹۷۰ کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف بھی ایسا ہی فتویٰ جاری کیا گیا تھا۔ اس قسم کے فتوے ہر ملک کی انقلابی جماعتوں کے خلاف دیئے جاتے رہے ہیں) انتخابات کے بعد مختلف انقلابی گروپ' اور ترقی پسند جماعتیں باہم سر جوڑ کر بیٹھے۔ ان سب نے اپنی اپنی تنظیمیں توڑ ڈالیں اور ایک نئی جماعت کی بنیاد رکھی۔ اس جماعت کا نام کوریا ورکرز پارٹی تجویز ہوا۔ یہی جماعت آج برسر اقتدار ہے۔

موجودہ صدی کا وسطی حصہ شروع ہوا، تو کوریا میں سامراجی جرائم بھی شدت اختیار کر گئے۔

دوسری جنگ عظیم کی فاتح اتحادی فوجیں ابھی تک کوریا کے جنوبی حصے، جاپان، اور تائیوان میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھیں تاکہ جنوب مشرقی ایشیا میں مسلح جدوجہد آزادی کو روکا جا سکے۔ چین کا تجربہ ان کے سامنے تھا۔ کومنتانگ کی فوجوں کو بے پناہ امداد دی گئی مگر کائی شیک کا ۲۵ سالہ اقتدار سرخ فوج نے اکھاڑ پھینکا چنانچہ سامراجی ممالک اس فیصلے پر پہنچے کہ ان کے پٹھو اور کاسہ لیس کسی جگہ بھی انقلابی جنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان ممالک کو سوشلسٹ یلغار سے بچانے کی صرف یہی صورت باقی ہے کہ بذات خود جنگ میں کود جائے۔ جب جنوبی کوریا میں عوام نے بغاوت کر دی اور شمالی کوریا کی افواج فتح کے پھریرے لہراتی آگے بڑھنے لگیں تو سامراجی ممالک نے بھی کوریا پر حملہ کر دیا۔ شمالی کوریا کی بہادر افواج نے امریکی اور برطانوی فوجوں کو سمندر کے کنارے تک دھکیل دیا۔ تاہم اس سے قبل کہ پورا کوریا آزاد ہو جاتا، سامراجی نئے ساز و سامان کے ساتھ، اور نئی کمک کے ساتھ حملہ آور ہوئے۔ اور یوں جنوبی کوریا میں اپنے قدم دوبارہ جما پائے۔ یاد رہے، کہ کوریا کی جنگ میں پہلی بار آواز سے تیز رفتار طیارے استعمال ہوئے۔ سیبر ایف ۸۴ جیٹ فائٹر، امریکا نے پہلی بار شمالی کوریا کے عوام کے خلاف استعمال کیا تھا۔ مسٹر جانی جانسن اپنی کتاب "مکمل دائرہ" کے صفحہ ۲۶۴ پر رقم طراز ہیں: "پُسان کے امریکی فوجی کمانڈر نے مجھے بتایا کہ ہماری فوجیں کسی صورت زمین پر جم نہیں سکتی تھیں۔ کمیونسٹوں نے ہمیں سمندر میں پھینک دیا ہوتا، اگر جاپان کے اڈوں سے سیبر طیارے ہماری مسلسل مدد کو نہ آتے۔" تاہم

جب ایک زمانہ شمالی کوریا پر چڑھ دوڑا، تو روس اور چین نے بھی شمالی کوریا کی امداد کا اعلان کر دیا۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے چین میں رضاکار فوج کے قیام کا اعلان کر دیا اور یہ رضاکار دستے جب محاذ پر پہنچے تو پھر جا کر سامراجیوں کی یلغار رکی۔ تاہم جنوبی کوریا میں امریکی اور دیگر یورپی افواج تھیں۔ وہ بظاہر "جمہوریت"، "امن" اور "عوام کی آزادی" کے لیے مصروفِ جنگ تھیں لیکن ان بدمست یورپی فوجیوں نے کوریا کے اس حصے کو طوائفوں کے بازار میں بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے کوریا کی معیشت سے لے کر عورت تک ہر چیز پر قبضہ کیا اور پورا پورا معاوضہ وصول کیا۔ دوسری جانب سرخ افواج شمالی کوریا کی مدد کو آئیں۔ ان رضاکار چینی افواج کے لیے چیئرمین ماؤزے تنگ کا حکم نامہ ملاحظہ فرمائیے: "چینی اور کوریائی انقلابی بھائیوں کی مانند متحد ہو جائیں۔ ہماری موت و حیات، غم اور خوشی ایک ہے۔ اور دشمن کو آخری شکست دینے تک ہماری مشترکہ جدوجہد جاری رہے گی۔ کوریا کا مسئلہ ہمیں اپنا مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا کوریا کے ہر پہاڑ، ہر دریا، ہر درخت، حتیٰ کہ ہر گھاس کے تنکے کو بھی آزاد کرائیں۔ مگر آپ کوریائی ساتھیوں سے اپنے لیے سوئی یا دھاگہ بھی طلب نہ کریں۔ یہ سمجھیں کہ آپ اپنے لوگوں اور اپنی قوم کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں:"

تاہم ایک طویل جنگ کے بعد سامراجی اس جنگ سے اکتا گئے۔ انھوں نے فائر بندی کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ اور اس وعدے پر لڑائی بند کرا دی کہ دونوں کوریاؤں میں انتخاب ہوگا۔ اور عوام جسے چاہیں برسرِ اقتدار لے آئیں گے۔ یہ وعدہ آج تک ایفا نہ ہو سکا۔ اسی طرح کا "انتخابی وعدہ" ویت نام میں کیا گیا تھا۔ مگر وہاں بھی اسے پورا نہیں کیا گیا۔ نتیجۃً ویت نام سے بوریا بستر باندھ کر امریکہ کو واپس جانا پڑا۔ یہ سامراج کی پالیسی ہے کہ وہ "انتخاب" اور "حقِ رائے دہی" کا وعدہ کیا کرتا ہے۔ اس وعدہ کی آڑ میں اپنا اقتدار مضبوط بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر کسی صورت میں انتخاب نہیں کرایا کرتا۔ انتخاب صرف امریکہ ہی میں ہوتے ہیں۔ رہے ہم اور آپ جیسے ممالک تو ان میں امریکہ والے کچھ

گوریوں سے نہیں کھیلتے۔ یہاں کے لیے ان کی پالیسی اور ہوا کرتی ہے۔ اور کوریا آج تک اسی پالیسی کا شکار ہے۔ اُسے جبری طور پر دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے جنوبی کوریا کا دارالحکومت سیئول ہے اور شمالی کوریا کا دارالخلافہ پیانگ کانگ ہے۔ پچھلے ۲۵ سالوں میں ان گنت بار فائر بندی کی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ فریقین ایک دوسرے پر ان خلاف ورزیوں کا الزام دھرتے ہیں۔

شمالی کوریا والوں کی "سرنگ کنی" بہت مشہور جنگی حربہ ہے۔ جنوبی کوریا میں موجود امریکی فوجی بارڈر کے قرب وجوار میں ہر وقت زمین پر کان لگائے لیٹے رہتے ہیں کہ کہیں کمیونسٹ نیچے ہی نیچے سرنگ لگا کر جنوبی کوریا میں نہ گھس آئیں۔ پتہ چلا ہے کہ انسانی جنگوں کی طویل ترین سرنگیں شمالی کوریا والوں نے اس محاذ پر کھودی تھیں۔ اب بھی امریکہ کو ان سے یہی خطرہ درپیش رہتا ہے۔

میں جنوبی کوریا میں نہ جا سکا۔ لہٰذا وہاں کے نظامِ حیات کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے ایک محترم شفیق شورش ملک (جنگ راولپنڈی) ۱۹۷۳ میں وہاں گئے تھے۔ جب میں شمالی کوریا سے واپس آیا تو ہم دونوں نے بیٹھ کر دونوں کوریاؤں پر بحث مباحثہ کیا اور اپنے اپنے تجربات کے حوالے سے ان کی سماجی زندگی پر روشنی ڈالی۔ شورش ملک صاحب اور میں کوریا کے متعلق کسی ایک نکتۂ نظر پر متفق نہ ہو سکے۔ کیوں کہ دونوں حصوں کے نظام ایک دوسرے کی عین ضد ہیں۔ لہٰذا ایسے معاملات میں بات ممالک سے پھسل کر نظاموں کی فکری اساس پر بحث و مباحثے میں بدل جایا کرتی ہے۔ لہٰذا ہماری بحث بھی عملی کم اور نظریاتی زیادہ رہی۔ چنانچہ میں اتنا ہی جان سکا کہ جنوبی کوریا میں صنعت بہت ہے (گرچہ جاپان اور امریکہ کی ملکیت ہے)۔ تعلیم بھی بہت ہے (کیونکہ شمالی کوریا مقابلے پر ہے) زراعت میں جاگیرداری نظام کو ختم کر دیا گیا ہے (چونکہ شمالی کوریا کے مشترکہ فارم سامنے ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

آج کے مہذب دور میں جسے بالخصوص یورپ والے مہذب کہتے نہیں تھکتے یہ کتنی بڑی

ستم ظریفی ہے کہ کوریا جیسے قدیم ملک کو ان مہذب مہم بازوں نے جبراً دو حصوں میں منقسم کر رکھا ہے۔ انسانی حقوق کا چارٹر دینے والے کیا کوریا کے عوام کو انسان نہیں سمجھتے؟ تاہم وقت کی رفتار، امریکہ کے برخلاف ہے۔ وہ وقت دور نہیں کہ اسے یہاں سے بھی فوجیں ہٹانا پڑیں گی اور دونوں کوریا ایک ہو سکیں گے۔ ویت نام کی مانند پھر سے یک جا ہو پائیں گے۔

کوریا کے ایک ثقافتی شو میں

ہمارے دورہ کوریا کے دوران جمنا یزیم ہال میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ کوریا کی ورکرز پارٹی کے چیدہ چیدہ کارکن اور رہنما پورے ملک کے طول و دراز سے آئے تاکہ وہ اس تاریخی تقریب میں وزیر اعظم بھٹو کے خیالات سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں، جمنا یزیم ہال بہت وسیع ہال ہے۔ اس میں ۲۰ ، ۲۵ ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اور اگر لوگ درمیان کی خالی جگہوں میں کھڑے ہو جائیں تو کل تعداد تیس

ہزار سے اُوپر بھی جا سکتی ہے! اتنا بڑا ہال شاید ہی دُنیا کے کسی اور ملک میں ہو۔ جس دن وزیر اعظم بھٹو نے یہاں خطاب کرنا تھا۔ یہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ورکرز پارٹی کے کارکنوں کے علاوہ عوامی فوج آزادی کے مجاہد اور فیکٹریوں کے محنت کش بھی موجود تھے۔ جناب بھٹو نے تقریر کرتے ہوئے کہا " میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ کوریا کے عظیم عوام، صدر کم کی انقلابی قیادت تلے شاہراہِ ترقی پر انتہائی تیزی سے گامزن ہیں۔ ہم پاکستان میں بسنے والے کوریائی عوام کی جدوجہد کو سلام کرتے ہیں۔ آپ نے سامراج اور استحصال کے خلاف بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ ہم آپ کی قربانیوں کو مشعلِ راہ سمجھتے ہیں۔ ہم قوموں کی جدوجہد آزادی کی حمایت کرتے ہیں۔ ہم نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد میں ایمان رکھتے ہیں۔ ایشیا کے عوام عظیم ہیں انھوں نے تاریخ میں بے پناہ قربانیاں پیش کی ہیں۔ سامراج نے ایشیا کو قربان گاہ بنا رکھا ہے ۔

سامراجی نظام نے ان کی زندگی بوجھ تلے دبا رکھی ہے۔ اگرچہ بہت سے ممالک سامراج کی گرفت سے آزاد ہو چکے ہیں۔ تاہم ابھی بہت سے ممالک اس چنگل کا شکار ہیں۔ سماجی اور اقتصادی طور پر۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ ہم آزادی کا سانس لینا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمیں ایک سامراجی ایجنٹ ملک کے ساتھ تین بار جنگ لڑنی پڑی۔ عالمی سازش کی گئی اور اس طرح ہمارے ملک کے دو ٹکڑے کر دیے گئے۔ ہم اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کی تعمیرِ نو میں مصروف ہیں۔ کوریا اور پاکستان دونوں ایشیائی ملک ہیں۔ ہمارے عوام کی منزل ایک ہے ۔ آپ سوشلسٹ ریاست ہیں۔ ہم بھی سوشلسٹ معیشت پر یقین رکھتے ہیں، ۱۹۷۰ کے عام انتخابات میں ہماری پارٹی کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ عوام نے ہمیں اقتدار دیا تھا۔ تاکہ ظلم اور استحصال کا دور ختم کیا جا سکے۔ اور ہم عوام کے تعاون کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ہم تیسری دُنیا کے رنگ دار اور کالے لوگ ہیں۔ ہمیں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے مسائل ایک سے ہیں۔ ہمیں ایک منصفانہ بین الاقوامی اقتصادی نظام اپنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ تاکہ امیر ممالک غریب ممالک کا استحصال نہ کر سکیں۔ ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا ۔

پیرس کانفرنس اور نیروبی کانفرنس ناکام ہو چکی ہے۔ ہمیں سب کو مل کر کانفرنس بلانی چاہیے“…… (تالیوں کی لمبی گونج)

وزیر اعظم بھٹو سے قبل پیانگ یانگ انقلابی کمیٹی کے چیئرمین نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے وزیر اعظم بھٹو کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اور یوں کوئی دو گھنٹے بعد یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

بارے کچھ ذکر پیانگ یانگ کا ہو جائے۔ جہاں امریکی بم بازوں نے دوران جنگ اس کثرت سے بم گرائے کہ یہ شہر چھلنی کی مانند کر دیا۔ ہر مربع گز زمین پر اوسطاً دو بم گرائے گئے۔ اور یوں اس شہر کی ہستی کو جلا کر رکھ دیا۔ مگر دھن حوصلہ ہے انقلابی کوریا والوں کا۔ انہوں نے چاک گریباں کچھ اس خوبصورتی سے رفو کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس شہر کو اب دیکھیے تو گمان ہوتا ہے کہ جیسے یہاں آسمان سے آگ نہ برسی ہو گی۔ جیسے کبھی یہاں بم اور بارود کا زہر نہ پھیلا ہو گا۔ یہ حسین پھول کبھی نہ جھلسے ہوں گے۔ خوبصورت فراخ سڑکیں، بجلی سے چلتی بسیں۔ سکول آتے جاتے بچوں کے ہاتھ میں لہراتے سرخ پرچم۔ ہر چیز صاف ستھری۔ نپی تُلی اور سلیقے سے سجی۔ اُجلے دُھلے راستے، گلیاں اور بازار۔ صاف پاک اور ہوادار مکان۔ خوب صورت پارک بنے ہیں، جہاں بچے کھیلتے کودتے یا جھولا جھولتے، خوشی کے نغمے گاتے نظر آئیں گے۔ نہ کہیں ہنگامہ، نہ گندگی، نہ غلاظت، نہ کہیں گٹر ہول کھلے ہیں نہ نالیاں غائب ہیں یا بھینسیں سر راہ کلیلیں بھرتی، گوبر اور پیشاب کے پچکارے مارتی نظر آئیں گی۔ نہ ٹریفک کے سپاہی کہیں بھتہ وصول کرتے پائے۔ بلکہ ’ٹریفک پولیس‘ جیسا موثر محکمہ ہی ان کے ہاں سرے سے معدوم۔

شہر کے بیچوں بیچ ایک دریا بہتا ہے۔ عوام، یہاں کشتی رانی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ فراغت کے وقت سینما ہال جاتے ہیں۔ ہاں مگر وہاں ”بڑک“ نہیں مارتے۔ ڈرامے دیکھتے ہیں مگر سٹیج پر آلو، پیاز یا گندے انڈے نہیں چلاتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں بڑک مار فلمیں نہیں دکھائی

جاتیں۔ یا بے معنی مضمونوں پر مبنی ڈرامے نہیں دکھائے جاتے۔ ہر کوئی رقص کرتا ہے اور اسے جسمانی عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ مگر کوئی ہیرا منڈی یا نپیئر روڈ نہیں جہاں رقص کرنے والے اور ہوں اور ان پر نوٹوں کی برسات کرنے والے اور موسیقی کو روحانی عبادت سمجھتے ہیں۔ خوشی، اور جدوجہد کے نغمے سنتے ہیں، ہنستے، گاتے اور جی بھر کر جی بہلاتے ہیں۔ تاہم آپ کو کوئی گیت اس طرح کا نہ ملے گا۔

"آ سینے نال لگ جا ٹھا کر کے"

یہ فصاحت و بلاغت، یہ ذو معنی عظیم شاعری، صرف ہمارے ہاں ہی تخلیق ہو سکتی ہے۔ پھر عظیم موسیقار، عظیم شاعر اور گلوکار اسے عوام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ کلچر میں رنگین اضافے کرتے ہیں۔ اور یوں، اپنا اور قوم کا نام روشن کرتے ہیں۔ بے چارے کوریا والے فصاحت و بلاغت کی ان بلندیوں سے ناآشنا ہیں۔ یہاں کے لوگ محنت کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ ڈٹ کر کام کرتے ہیں۔ اور اپنا سر فخر سے بلند کر کے چلتے ہیں۔

پیانگ یانگ شہر کے عین وسط میں جمنازیم ہال ہے۔ اس ہال میں تقریباً ۲۵ ہزار کے بیٹھنے کی گنجائش ہے! یہاں جناب بھٹو اور صدر کم ال سنگ نے خطاب بھی کیا۔ اس عظیم ہال کے ساتھ ایک وسیع گراؤنڈ ملحق ہے۔ جہاں رات کے دس بجے بھی، کالجوں کے نوجوان اور مزدور آپ کو جسمانی ورزش کا مشترکہ مظاہرہ کرتے نظر آئیں گے۔ کوریا والے جسمانی ورزش کو ایک علم کی مانند قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ہر فرد، خواہ کسی عمر، کسی عہدے یا کسی جگہ کیوں نہ ہو۔ اس پر جسمانی ورزش لازم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عورت ہو یا مرد جب سڑک پر چلتا ہو تو آپ کو اس کی پنڈلیوں پر مچھلیاں نظر آئیں گی۔ آپ جہاں چاہے گھوم پھر کر دیکھ لیجیے، آپ کو کہیں کوئی زرد چہرہ، لاغر، نحیف و نزار یا بڑھے ہوئے پیٹ والا فرد نظر نہ آئے گا۔

پیانگ یانگ کی آبادی کوئی ۱۲ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، کہ سڑک پر رش نام کی کوئی چیز نظر آئی۔ بار بار سوچا، اور ساتھیوں سے پوچھا بھی کہ یہ کیسا دارالحکومت

ہے جہاں گمبھیر خاموشی ہر جانب راج کیے بیٹھی ہے۔ خیال آیا کہ کامریڈ لوگ یا تو نیکروں ہی میں سو جاتے ہیں، یا پھر آج کل چھٹی پر ہیں، اور اپنے گھروں میں لمبی تان کر سوتے ہیں یا پھر کہیں ریہرسل کے طور پر زیر زمین چلے گئے ہیں، شاید۔ پر ایک صبح ہم پر یہ عقدہ وا ہو ہی گیا۔ پتہ چلا کہ یار لوگ واقعی زمین چلتے ہیں۔ اور اک دنیا تو زمین کے نیچے آباد ہے۔ زمین کے نیچے ریلوے کا خوبصورت نظام بنایا گیا ہے۔ خواتین ریلوے کی وردی پہنے ٹکٹ چیکر، گارڈ اور ڈرائیور کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ بہت سی اہم فیکٹریاں بھی زیر زمین ہیں۔ تاکہ دورانِ جنگ ایٹمی حملوں سے بچاؤ رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ زیر زمین ریلوے کا نظام یورپی زیر زمین ریلوے کے نظام سے زیادہ گہرائی میں بنایا گیا ہے۔ یہ نظام ابھی تکمیل کے مراحل میں ہے۔ یعنی فی الوقت گیارہ اسٹیشن ہیں، مزید کی تعمیر جاری ہے۔ یہ سب انھوں نے خود بنایا ہے اور کوریا کے محنت کشوں کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایسی قوم جن کی آبادی محض ڈیڑھ کروڑ ہے۔ رقبہ صوبہ سندھ جتنا، اور جن کی براہِ راست جنگ امریکہ سے ہے۔ اور جو بیس سال تک جنگِ آزادی اور بعدازاں دو سال تک مکمل جنگ سے گزرے ہیں!

صنعتی لحاظ سے بھی کوریا بہت آگے ہے۔ سوائے ہوائی جہاز کے ہر شے خود بناتے ہیں۔ ٹینک، ٹریکٹر، ٹرک، آلات زراعت، بھاری مشینری، فولاد، ٹی وی، ریڈیو، میڈیکل کا سازوسامان۔ الغرض کوریا میں آپ کو ہر شے "کوریا میڈ" ہی ملے گی۔ یہ ساری برکتیں سوشلسٹ نظام کی عطا کردہ ہیں۔ سامراجی غلامی اور جاگیردارانہ چنگل سے آج کسان آزاد ہے۔ اور ملک کی زرعی ہیئت، اب انتہائی تیزی کے ساتھ، صنعتی شکل میں بدل رہی ہے۔ مگر اس کا پھیلاؤ، سرمایہ دار ممالک کی طرح غیر متوازن نہیں۔ ایک منظم سوشلسٹ اقتصادی پالیسی کے تحت، یہاں کی اقتصادیات، پرانی شکل سے نئی صنعتی شکل میں ڈھل رہی ہے۔ قدیم جاگیردارانہ رشتے، نظریات، اور ثقافت، کا بالائی ڈھانچہ، تقریباً ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ اب اس کی جگہ نئی مُصفّا مساویانہ اور انسانی روایات تخلیق کی جا رہی ہیں۔ ہمت، محنت اور کوشش کا یہ عالم ہے کہ ایک جگہ ہم نے پتھر کو دھنک کر روئی کے ریشوں میں ڈھلتے دیکھا۔ ہمارے بستر پہ جو نرم اور نازک خوبصورت چادریں بچھی تھیں، وہ اسی پتھر کی بنائی گئی تھیں۔ فولاد کے عظیم کارخانے دیکھے، صنعتوں کا جال دیکھا۔ اور یہ سب کچھ دیکھ کر اپنا وطن یاد آیا! یہ سوچ کر ایک گونہ اطمینان بھی ہوا کہ آخر ہم نے بھی کچھ مخصوص شعبہ ہائے حیات میں لازوال پیش رفت کی ہے۔ مثلاً ملاوٹ، رشوت جھوٹ، بددیانتی، چور بازاری اور اسمگلنگ ایسے فنونِ لطیفہ ہیں، کوریا والے تو کیا، اُن کے بزرگ بھی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم بہت عظیم ہیں۔ فوجی جرنیلوں کی قیادت میں، ہم نے ایک سے دو پاکستان بنا لیے ہیں۔ آئین؟ بنا بنا کر توڑتے ہیں۔ اور توڑ توڑ کر بناتے ہیں۔ جب تک ہو سکا، بناتے اور توڑتے رہیں گے۔ کیونکہ جس دن توڑنے کو کچھ نہ رہا، اس دن فارغ ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ترقی؟ جی بہت! پہلے صرف چند لوگ حج پر جاتے تھے۔ اب بہت سے جاتے ہیں، چنانچہ ثابت ہوا کہ بہت ترقی ہوئی ہے۔ روپے پیسے کی کمی انھیں ہو گی، جن کے پاس عقل جیسی شے کی کمی ہے۔ ہمارے پاس نوکر شاہی "عقل کل" کی مانند موجود ہے۔ چنانچہ "کاغذ کے ٹکڑوں" کے لیے ہم کاہے کو ترسیں گے۔ لہٰذا ۱۰ ارب کاغذ کے ٹکڑے

ہمارے ہاں سستے داموں دستیاب ہیں۔ بلکہ خدا کے فضل سے جلدی اس قابل ہو جائیں گے کہ انھیں دساور بھیج کر زرمبادلہ بھی کما سکیں۔

مادی ترقی؛ جی مادی ترقی، مادہ پرست کفار کا شیوہ ہے۔ ہم ماتے پر مایا کو ترجیح دیتے ہیں، اور جہاں محنت کا مسئلہ درپیش ہو، وہاں توکل پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس جہاں میں امریکہ بہادر اور اگلے جہان میں فرشتے۔ سو، ہم ہر جھنجھٹ اور فکر سے آزاد ہیں۔ اور اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو آزاد صرف ہم ہی ہیں۔ ہم شاہین ہیں، ہم مومن ہیں اور برگزیدہ لوگ ہیں۔ جہاں گیری و جہاں بانی، ہیرو گیری اور نگہ بانی نہیں؛ اپنا پیدائشی فرض ہے۔ چنانچہ یہ فرض ادا کرنے دینے، پاسپورٹ کے بغیر بھی دنیا کے ہر ملک میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ پکڑے جاتے ہیں، سزا کھاتے ہیں اور کھاتے رہیں گے مگر "فرض" سے منہ نہ موڑیں گے۔

زیر زمین ریلوے؛ جی ہاں اگر اپنے ہاں کوئی ایسا منصوبہ بنتا۔ تو ہم کیا اتنے ہی احمق تھے کہ زمین کھودتے پھرتے۔ نیک دل اور عقل مند افسر فائل ہی پر ٹرین چلا دیتے۔ یوں ہم محنت سے بھی بچ جاتے اور کام بھی "جلدی" ہو جاتا۔ کوریا والوں نے ہمیں بتایا، کہ وہ پورے کوریا میں بجلی پہنچا چکے ہیں۔ اور یہ سن کر ہمیں اپنا "واپڈا" بہت یاد آیا۔ ہم نے سوچا، ہو سکتا ہے کامریڈ لوگ؛ کچے کھمبے لگا بیٹھے ہوں۔ ہو سکتا ہے "تاروں کی بجائے دھاگے اور رسیاں باندھ کر بجلی گزارنے کی غلطی کر بیٹھے ہوں۔ "پکا" کام نہ کر سکے ہوں کہ آخر کو "کافر" ہیں اور اس حوالے سے کم عقل ہیں۔ ان کی کچھ تو امداد ہونی چاہیے۔ کہ "پکا" کام آخر کو پکا ہی ہوتا ہے۔ اور سو برس چلتا ہے۔ اور "پکے" کام کے لیے واپڈا ایسا "پکا" محکمہ ہی مناسب ہے لہذا اپنے "واپڈا" کو کچھ عرصہ یہاں بھیج دینا چاہیے، کوریا والوں پہ احسانِ عظیم بھی رہے گا۔ اور ان کے بلب پہلے سے دوگنا زاید بجلی بھی دینے لگیں گے۔

جرائم؛ جی ہاں یہاں جرائم نہیں ہوتے۔ نہ قتل، نہ ڈاکے، نہ زنا اور نہ اغوا، نہ رشوت اور ملاوٹ۔ کوریا والوں نے بتایا۔ یہ جرائم صرف ان ممالک میں ہوتے ہیں۔ جہاں جاگیردارانہ نظام

ہو یا سرمایہ داری کا سکہ چلتا ہو۔ چوں کہ ان کے ہاں اجتماعی زندگی کا طریقہ مروج ہے۔ لہٰذا کوئی قتل یا ڈاکہ کیوں مارنے لگا۔ عورت کو وہ انسان سمجھتے ہیں۔ مرد کے برابر حقوق دیتے ہیں لیے تعلیم دیتے ہیں، کام دیتے ہیں۔ لہٰذا وہاں کوئی اسے اغوا نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے۔ پھر اُسے کوئی بے عزت کیوں کر سکتا ہے؟۔ پر ہم نے سوچا' ہو سکتا ہے کوریا والوں کی پولیس بہت "نااہل" ہو۔ جرائم کا کھوج ہی نہ لگا سکتی ہو۔ جبھی تو پُورے کوریا میں اتنے جرائم بھی نہیں ہوتے، جتنے ہمارے ہاں ایک تھانے کا ریکارڈ ہے۔ چونکہ ہماری پولیس کا فرض ہے کہ آپ کی مدد کرے۔ لازم حساب وکتاب کرے۔ آپ کچھ کریں نہ کریں پر وہ پُورا احتساب کرے۔ یہی وہ باریک نکتہ تھا، جو ہمیں بار بار کوریا والوں کو سمجھانا پڑا۔ مگر توبہ جی ایسی لطیف باتیں کوئی غیر کیا سمجھے گا۔

جہیز؟ جی نہیں۔ لڑکی لڑکا ایک دُوسرے کو پسند کر لیں۔ پھر اپنے کمیون یا شہری کمیٹی کو اطلاع کر دیں۔ کمیٹی کے دفتر میں انھیں باہمی رضامندی کے معاہدے پر دستخط ڈالنا ہوگی۔ حاضرین 'مبارک باد' کا غلغلہ بلند کریں گے۔ پھُولوں کی بارش ہوگی، کہ کوریا میں بہت ہیں اور مفت ملتے ہیں۔ اور بس لیجیے، شادی کی ساری منزلیں طے ہو گئیں۔ حکومت اب انھیں علیحدہ مکان مہیا کرے گی اور وہ ہنسی خوشی رہنا بسنا شروع کر دیں گے۔ طلاق بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن بہت کم۔ اصلاحی کمیٹی سمجھا بجھا کر معاملہ درست کرانے میں اکثر کامیاب ہو جاتی ہے۔

اگر آپ شاعری سے تھوڑی بہت شُدبُد رکھتے ہیں، تو پھر یُوں جانیے کہ کوریا ایک خُوب صُورت نظم کی مانند ہے، بلکہ فیض احمد فیض کی انقلابی اور رُومانی نظم۔ کوریا حسنِ فطرت اور سعیِ انسان کا حسین امتزاج ہے۔ مثلاً جس درخت کی جہاں ضرورت ہے، وہ وہیں نظر آئے گا، الم غلم، بے کار، بے بار اور فالتو درخت یا پودے صاف۔ ان کی جگہ پھل دار یا دوسرے کارآمد پودوں کی منظم شجرکاری۔ چونکہ غلاظت اور گندگی نہیں، لہٰذا چیل، کوّے اور گدھ ناپید۔ مکھی، چُوہے اور اس قبیل کے دُوسرے جانور بھی معدوم۔ تاہم حلال جنگلی پرندوں اور جانوروں کی بہت قدر

کی جاتی ہے۔ بلکہ کوریا والے انھیں اپنی دولت میں شمار کرتے ہیں۔ ہر جگہ درختوں پر لکڑی کے بنے بڑے گھونسلے آویزاں کرتے ہیں۔ تاکہ جنگلی مرغ، فاختہ، تیتر، کبوتر اور بٹیر وغیرہ لکڑی کے ان گھونسلوں ہی میں رین بسیرا کریں۔ انڈے بچے دیں اور پھلیں پھولیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بازار میں آپ کو ان پرندوں کے انڈے اور گوشت وافر تعداد میں بکتا نظر آئے گا۔ گھریلو مرغ سے بھی کہیں زیادہ۔ عام شکار کی اجازت نہیں کہ جس کا جی چاہے بندوقیں بھر بھر چلاتے۔ یہاں بھی کسی حساب اور قاعدے سے چلتے ہوں گے۔ کوریا میں انسان تو انسان سے خیر کا ہے کو ڈرے گا۔ ہم نے محسوس کیا کہ پنچھی بھی انسان سے نہیں ڈرتے۔ ریسٹ ہاؤس کے لان میں جنگلی مرغ اور تیتر آزادی سے باہم چونچ لڑاتے دیکھے۔ آدمی پاس سے گزرتے تب بھی ڈر کر اڑتے نہیں۔ بلکہ ترنگ آتے تو بعض اوقات کمرے کے اندر آنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

آپ نے اکثر نوٹ کیا ہوگا کہ اپنے ہاں ریلوے پٹڑی کے ساتھ ساتھ، زمین کا خاصا ٹکڑا فالتو اور بے کار حالت میں پڑا رہتا ہے۔ اس خالی قطعہ اراضی پر چند مجہول قسم کی جڑی بوٹیاں اُگتی گلتی سڑتی رہتی ہیں یا پھر اُس پر پالک کے جوہڑ نظر آتے ہیں۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف اس کھاتے میں ہزاروں ایکڑ اراضی ضائع ہو جاتی ہے۔ کوریا میں ایک انچ زمین بھی بے مصرف نہ ملے گی۔ ریلوے پٹڑی کے ساتھ، انگور یا اس قسم کا کوئی اور فروٹ اگایا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس عمل سے نہ جانے کتنا فروٹ پیدا کرتے ہوں گے۔

پیانگ یانگ سے ہم ہانگ کا سفر بھی کرنا نصیب ہوا۔ یہ سفر ہم نے ریل گاڑی پر کیا جبکہ کچھ لوگ بذریعہ طیارہ بھی گئے۔ ہم ہانگ کوریا کا صنعتی شہر ہے۔ استقبال کا یہ عالم تھا کہ جیسے نہ تھمنے والا طوفان ہو۔ جب صدر کم ال سنگ اور وزیر اعظم بھٹو عوام کی استقبالی لائن کے قریب گئے۔ تو میں نے دیکھا نوجوانوں کی آنکھیں فرطِ جذبات سے تر ہو جاتی تھیں۔ لوگوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ آج اُن میں ایک ایسا مہمان آنے والا ہے جو امریکی سامراج کا دشمن ہے۔ جو پاکستان کے غریبوں کا حامی ہے، محنت کشوں کا رہبر ہے۔ جو پہلا پاکستانی حکمران ہے۔ جس نے ملک کو امریکا

اور مغرب کے چنگل سے آزاد کرایا۔ اور جب اس مہمان کے ساتھ، صدر کم ال سنگ ہاتھ میں ہاتھ لئے سامنے آئے تو پھر، نعروں کی گونج، وہائٹ ہاؤس تک محسوس کی گئی ہو گی۔ کم ال سنگ کوریائی عوام کے لئے زندہ دیوتا کی مانند ہیں۔ ایسے دیوتا جنہوں نے جاپان کو شکست دی۔ امریکا کو مار بھگایا۔ ملک کے اندر چھوٹے اور بڑے کا فرق ختم کر دیا۔ آج محنت کشوں کا راج ہے اور ہر جانب خوشیوں کے شادیانے۔

شہر ہم ہانگ سے جب واپس چلے تو راستے میں ایک جگہ ایک کتا نظر آیا، جو پٹڑی سے ذرا پرے بے حد تنہا، انتہائی کسمپرسی کے عالم میں کھڑا تھا یوں لگتا تھا جیسے بے چارہ کئی دنوں سے بھوکا مارا مارا پھر رہا ہو۔ میں نے اپنی ترجمان سے پوچھا۔ "کیوں صاحبہ! یہ نجس العین" یہاں کیسے؟ مسکرا کر کہنے لگیں: "سرحد قریب ہے، جنوبی کوریا سے آ گیا ہو گا۔ ہم نے سوچا، اگر "یہ نجس" اپنی لاغری کا بوجھ اٹھائے، کسی طور جنوبی کوریا واپس پہنچ جائے، تو مہذب دنیا میں ایک تہلکہ مچ سکتا ہے۔ مغربی پریس، کے لئے "یہ کتا، اور اس حالت میں"۔ کتنی بڑی خبر بن سکتا ہے۔ یار لوگ اس کے فوٹو صفحہ اوّل پر چھاپیں گے۔ اس کی عف عف کا انٹرویو ریکارڈ کریں گے۔ جسے ریڈیو پہ بجائیں گے اور ٹیلی ویژن پر دکھائیں گے۔ اور کہیں گے "دیکھ لو! اگر اشتراکیوں کے ہاں ایک بے زبان کا مارے بھوک کے یہ حشر ہو سکتا ہے تو پھر وہاں انسانوں کا حشر کیا نہ ہوتا ہو گا؟ لہٰذا سوشلزم سے بچو"۔ یہ بھی عین ممکن ہے، انسداد بے رحمی جانوراں کا عالمی محکمہ اس نازک مسئلے کو اقوام متحدہ میں پیش کر دے۔ ہو سکتا ہے انسانیت نواز امریکا اس کتے کے غم میں مبتلا ہو کر شمالی کوریا پر حملہ کر دیں..... اور یوں تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے......

شمالی کوریا میں، تمام زمین پوری قوم کی ملکیت ہے۔ زمین کی کاشت امداد باہمی کے اصولوں کے تحت ہوتی ہے۔ زمین پر صرف اس کا حق ہے، جو کو اپریٹو فارم میں شامل ہو کر اس پر ہل چلاتا ہے اسی طرح ساری فیکٹریاں اور صنعتیں بھی قوم کی ملکیت ہیں جنہیں مزدور چلاتے ہیں۔ الغرض کوریا میں ہر شے عوام کی ملکیت ہے۔ نہ کوئی محمود ہے نہ ایاز۔ کوئی محتاج ہے نہ بندہ نواز، کوئی صاحب

ہے نہ نوکر۔ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ کوئی اونچا ہے نہ نیچا۔ کوئی امیر ہے نہ غریب۔ سبھی درجہ اوّل کے شہری ہیں۔ سب محنت کرتے ہیں اور جی بھر کر معاوضہ پاتے ہیں۔ کوریا والے کہتے ہیں کہ اُن کی فی کس آمدنی دس ہزار روپے سالانہ ہے۔ (ہماری ساڑھے تین چار سو روپے فی کس سالانہ آمدنی ہے) جاگیردار، خوانین، سردار، وڈیرے یا اس قبیل کے دوسرے جانور مثلاً سرمایہ دار وغیرہ، وہاں قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ عوامی عدالتیں، نچلی سطح ہی پر فوری انصاف مہیا کردیتی ہیں۔ لہٰذا انصاف آپ کو اپنے دروازے پر میسر آئے گا۔ وکیل کی ضرورت نہیں اور نہ یہ جنس وہاں پائی جاتی ہے۔ کو اپریٹو فارم یعنی کمیون میں جتنے مقدمات ہوں گے اسی کمیون کی عدالتی کمیٹی طے کردے گی۔ اسی طرح صوبائی اور مرکزی عدالتیں بھی ہیں۔ کوریا میں صرف ایک پارٹی کی حکومت ہے ہر پانچ سال کے بعد انتخاب ہوتے ہیں۔ ساری آبادی ووٹ دے کر اپنے نمائندے منتخب کرتی ہے۔ یہ نمائندے صوبائی قیادت کا چناؤ کرتے ہیں۔ اور صوبائی قیادت مرکزی قیادت کا چناؤ کرتی ہے۔ مگر حکومت کے اراکین پارٹی کے تابع ہیں اور پارٹی عوام کے تابع ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا زندگی کے ہر شعبے میں خواتین کام کرتی نظر آئیں گی۔ کھیتوں کھلیانوں، فیکٹریوں، دفاتر، فوج اور پارٹی میں الغرض ہر جگہ عورت اپنا مقام پیدا کرچکی ہے۔ لہٰذا یہ قدیم نظریہ کہ عورت ناقص العقل ہے یا جسمانی طور پر نازک ہے اسے صرف بچے پیدا کرنے چاہئیں۔ کوریا میں باطل قرار دیا جا چکا ہے۔ عورت کو بہت عزت اور بہت آبرو حاصل ہے شاید مردوں سے کچھ زیادہ۔

رہائش گاہ سرکار کے ذمے۔ مکان بنا کر عوام کو دے دیئے جاتے ہیں۔ وہ سارے مسائل جن کے بوجھ تلے سسک سسک کر ہم زندگی گنوا دیتے ہیں۔ وہ کوریا میں سرے سے وجود ہی نہیں رکھتے۔

سیاسی بات چیت میں ہمارے وفد کے اعلیٰ ارکان شامل ہوئے تاہم اندازہ ہے کہ مندرجہ ذیل اہم نکات پر باہم گفتگو ہوئی ہوگی۔

١ ۔ باہمی تجارت، ثقافتی اور فنی وفود کے تبادلے ۔

٢ ۔ پاکستان کے ذریعے فرانس یا دوسرے ممالک تک شمالی کوریا کا نکتۂ نظر پہنچانا ۔

٣ ۔ جنوبی کوریا کے مسئلے پر جنرل اسمبلی کی بحث میں پاکستان کا موقف ۔

٤ ۔ کشمیر کے متعلق بات چیت ۔

وزیر اعظم بھٹو نے اپنی کھلی تقریر میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر کوریا والے چاہیں تو جناب بھٹو جاپان ، امریکہ اور جنوبی کوریا سے مصالحت کی بات چیت چھیڑ سکتے ہیں ۔

گرچہ کوریا میں کسی کو روس پر تنقید کرتے نہیں سنا۔ تاہم یوں لگتا ہے جیسے صدر کم روس کی خارجہ پالیسی سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں۔ دلوں میں رنجش کی سوئیں اور عدم اعتماد کے خفیہ امکان بہرحال محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم جب صدر کم بیمار پڑے تو روس نے ڈاکٹروں کا ایک پینل ان کے علاج کے لئے کوریا بھیجا تھا۔ ان ڈاکٹروں میں صدر کم کے دیرینہ دوست بھی شامل تھے ، ہو سکتا ہے صدر کم نے ڈاکٹروں سے روس کے سرد رویے کا گلہ بھی کیا ہو ۔

جنوبی کوریا میں امریکہ اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت موجود ہے۔ امریکہ والوں کے سامنے دو واضح مقاصد ہیں۔ پہلا تو یہ کہ کسی بہانے شمالی کوریا کو اپنی بموں کا نشانہ بنائیں اور اسے صفحۂ ہستی سے ختم کر دیں۔ دوسرے اگر یہ ممکن نہ ہو (جو کہ نہیں ہے) تو پھر خطِ متارکہ کو دائمی صورت دے دیں اور جنوبی کوریا کو بھی اقوام متحدہ کا ممبر بنوا دیں۔ اس طرح آدھے کوریا پر ان کا قبضہ دائمی ہو جائے گا۔ ظاہر ہے ۔ یہ دونوں صورتیں صدر کم کو قبول نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا کوریا اس وقت ایک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے ۔ یہ لاوا کبھی بھی پھٹ سکتا ہے ۔

حق تو یہ ہے کہ روس بھی اتنے ہی زور سے شمالی کوریا کی امداد کرے۔ جس طرح امریکہ جنوبی کوریا میں موجود ہے ۔ موجودہ وقت طاقت کا توازن صرف اسی طرح رہ سکتا ہے کہ یا تو امریکہ جنوبی کوریا چھوڑ دے اور ووٹ کے ذریعے مسئلہ طے کر دیا جائے یا پھر روس بھی شمالی کوریا کی اسی پیمانے پر امداد کرے تاکہ توازن قائم رہ سکے ۔ اس مخصوص تناظر میں اگر صدر کم روس

سے گلہ کریں تو وہ حق بجانب ہیں۔

روس والے دوہری مصیبت میں پھنسے نظر آتے ہیں۔ شمالی کوریا ان کا نظریاتی حلیف بھی ہے اور ان کی سرحد پر واقع بھی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوں گے کہ ان کی سرحد میدان کارزار بنے لہٰذا وہ صدر کم پر پورا پورا دباؤ دیتے ہوں گے کہ وہ ہر حال میں اور ہر قیمت پر جنوبی کوریا کے ساتھ تنازعہ میز پر حل کریں۔ چنانچہ شمالی کوریا کو اپنے حلیف روس کا دباؤ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے اور دوسری جانب امریکہ کی مخالفت بھی۔ شاید اسی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ دونوں کوریاؤں میں چند سال قبل مذاکرات کے ایک دو دَور بھی ہوئے مگر تاحال کسی قابلِ ذکر پیش رفت کے آثار نظر نہیں آتے۔ چین والے شمالی کوریا کے نکتۂ نظر کے خاصے پُرجوش حامی رہے ہیں۔ تاہم چُو این لائی، ماؤزے تنگ اور مارشل چو تیہ کی وفات کے بعد اب جانے کیا صورت ہو۔ لہٰذا کوریا کا جھکاؤ بھی چین کی طرف ہے۔ یہ روس والوں کی ڈپلومیسی ہے یا پھر سادہ دلی، ورنہ کیا یہ بات سمجھنا دشوار ہے کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو یہ بارود کا دھواں ان کی سرحدوں کے اندر بھی داخل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا شمالی کوریا کا وجود روس کے اپنے وجود کے لئے بھی لازم ہے۔ بصورت دیگر ایٹمی راکٹ روس کی سرحد پر نصب ہوں گے اور پورا مشرقی روس ان کی خوفناک زد میں ہو گا۔

اب یہ بھی سُن لیجئے کہ انسانی حقوق کا پرچارک امریکا۔ شمالی کوریا میں انسان کشی پر کیوں آمادہ ہے۔ ویت نام، لاؤس اور کمبوڈیا میں ہزیمت کے بعد، جنوبی کوریا سامراج کا آخری مضبوط مورچہ ہے۔ اگر دونوں کوریا ایک ہو جائیں تو پھر سُرخ سویرے کی روشنی جاپان تک پھیل جانے کا پورا پورا امکان ہے۔ لہٰذا مسئلہ صرف کوریا کا نہیں بلکہ اس پورے خطے کو سوشلزم سے "محفوظ" کرنے کا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کوریا، چین اور روس دونوں کے سر پر واقع ہے۔ لہٰذا امریکہ فوجی نکتہ نگاہ سے ہر حال میں یہاں اپنے اڈے قائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ بوقت ضرورت وہ انہیں روس یا چین کے خلاف موثر طور پر استعمال کر سکے مغربی جرمنی، درۂ دانیال اور جنوبی کوریا، یہ تین وہ نازک مقام ہیں جہاں بیٹھ کر امریکہ، روس

کے اعصاب پر سوار رہ سکتا ہے، اسی طرح تائیوان اور جنوبی کوریا ہے۔ چین کے سر پر بھی میخ ٹھونکے ہوئے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ صدر کم پر سامراج کا حملہ صرف اس لئے نہیں کہ سامراج ذاتی طور پر اُن سے ناراض ہے۔ بلکہ اس "پُر امن جارحیت" کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سامراج کوریا کو تقسیم کر کے یا، تباہ کر کے، دراصل روس اور چین کو دفاعی لحاظ سے کمزور کرنا چاہتا ہے چنانچہ ان دونوں ممالک کی بقا اور بہتری اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ صدر کم کو سامراج کا لقمہ نہ بننے دیں۔ آج کے کوریا کا سب سے بڑا مسئلہ قومی بقا کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ، بوڑھا، وردی پہنے، ہر وقت مستعد نظر آئے گا۔ بچے سڑکوں پر قومی ترانے بجاتے چلیں گے اور آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے کوریا حالتِ جنگ میں ہے۔ جیسے ابھی سائرن بجا اور یہ لوگ ابھی محاذِ جنگ پر پہنچے۔ شمالی کوریا والے زندگی کے ہر شعبے میں خود کفالت کے لئے پُر جوش ہیں کیونکہ وہ اپنے تجربے سے اس حقیقت کا ادراک کر چکے ہیں، کہ دنیا میں قوموں کا آخری سہارا ان کے اپنے وسائل، ان کے اپنے عوام اور اُن کا اپنا وجود ہی ہوا کرتے ہیں۔ قومی سطح پر۔ خود انحصاری، خود کفالتی کا نکتہ ہی ان کی جدوجہد کا اصل مرکز ہے اور یہی "جوچے" کی تعلیمات ہیں۔

ایک بار چے گویرا نے کہا تھا "وت نامی پوری بزدل دنیا کے لئے تنہا جنگ لڑ رہے ہیں"۔ سچ جانیے تو آج کے دور میں شمالی کوریا بھی پورے ایشیا کے لئے جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ جنگ سرحدوں پر بھی ہے اور کھیتوں، کھلیانوں، فیکٹریوں اور درسگاہوں میں بھی لڑی جا رہی ہے اور نہایت کامیابی سے لڑی جا رہی ہے۔

اب ذرا مردِ قلندر کی بھی سنتے چلئے۔ ہم نے سوچا اپنے یار کی بھی خبر لینی چاہیئے۔ آب و ہوا کا فرق ہے، ماحول اجنبی ہے، کامریڈوں کے بیچ میں "مرغِ تنہا" ہے۔ شیر کس حال میں ہے؟ اور کوریا کے بارے میں، کس خیال میں ہے؟ کمرے میں پہنچے تو عجب نقشہ پایا۔ حضرت مدہوشی کی وجدانی منزل میں ہیں۔ "بوتل" خالی ہونے کو ہے انہیں یاد بھی نہیں کہ تیسری تھی یا چوتھی۔ ماحول

میں لپکپاہٹ، جسم میں تھرتھراہٹ، آنکھوں میں نمی، آواز میں رقت۔ پوچھا "یا حضرت! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" روتے چلاتے ہوئے فرمانے لگے "جی بس بہت ہو چکا۔ کیا کافر ملک ہے آج پانچ دن ہونے کو آئے ہیں۔ اذان کی آواز تک نہ سُن سکے۔"

عرض کیا "حضرت، آپ کا جذبۂ ایمانی بجا۔ لیکن اسی رفتار سے پیتے رہے تو یہاں میت کو غسل بھی نصیب نہ ہو گا۔" حضرت نے جھرجھری لے کر باقی ماندہ بوتل بھی گلے میں انڈیلی اور کہنے لگے "ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تمہارے کمیونسٹ، اللہ جانے جنازہ بھی اٹھائیں نہ اٹھائیں کیا اعتبار۔ ہائے ہائے۔ یہاں آ کر بہت ظلم کیا ہے۔" ہم نے ذرا اور چھیڑتے ہوئے کہا: "حضرت اگر ہم آپ ایسا کوئی مردِ مومن یہاں مر جائے تو یہ نابکار مُردے کی ممیائی نکال لیتے ہیں۔"... مردِ قلندر مدہوشی میں تو تھے نہیں۔ یہ فقرہ اِن کے ذہن سے چپک گیا۔ پوچھنے لگے "ایں... یعنی..... یہ ممیائی کیا؟" عرض کیا "حضرت! مُردے کا عرق نکالتے ہیں..... اور پھر اس سے انجکشن بناتے ہیں..." حضرت طبیعت کے سادہ ہیں اور یوں بھی چراغ تلے اندھیرا ہیں۔ ہماری "معلومات" پر فوراً ایمان لے آئے۔ جنم جنم کے اعصابی مریض ہیں، لہٰذا موت سے ہر وقت خائف رہتے ہیں..... اب جو خوف کر بیٹھ لی، تو رات کا کھانا بھی نہ کھایا۔ اور پی پا کر بستر پر ہی اُلٹ ہو گئے۔ یادش بخیر! کریمیا میں پڑاؤ ڈالے دوسرا یا تیسرا دن ہو گا۔ رات کے سمے، جب کھانے کی میز پر بیٹھے، تو کیا دیکھتے ہیں، کہ شراب کی بڑی بڑی بوتلیں میز پر لگی ہیں۔ ہر بوتل میں ایک سیاہ سانپ کنڈلی مارے موجود ہے۔ سانپ زندہ ہو یا مُردہ بہرحال سانپ ہوتا ہے۔ یار لوگ بھڑکے، اور ڈر ڈر کر نوالے توڑتے پائے۔ بعض توانا دل، حضرات کی پیشانیوں پر پسینے کے قطرے چمکتے دیکھے! وہاں پر موجود کریمیا کے ایک افسر سے پوچھا "جان برادر! ایں چیست" افسر نے جھک کر جواب دیا "سانپ ہے جناب" اس افسر کو کیا بتلاتے کہ ہم ڈالڈا کھا کر پلے ہیں۔ اور وہ بھی ملاوٹ زدہ! اپنے دل اتنے مضبوط کہاں کہ اس مرے ہوئے "شرابی سانپ" ہی کی دہشت برداشت کر سکیں۔

تاہم ۔ ہم نے اپنی ہمتوں کو ایک بار جمع کیا، اور پوری قوت مسکرانے کی کوشش کی اور کہا "سانپ مُردہ نظر آتا ہے"۔ افسر نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی بالکل" "اتنے میں کوئی اور صاحب کو ڈسے۔" "یعنی اسے شراب میں ڈالنے سے فائدہ؟" افسر نے بتایا، یہ تحفہ عزیز از جان مہمانوں کو ہی پیش کیا جاتا ہے۔ صدر کم کی خاص ہدایت پر، یہ "کشتۂ مار سیاہ" آپ کو پیش کیا گیا ہے۔

انہوں نے بتایا۔ یہ بہت کم یاب نسل کا سانپ ہے۔ اس کا زہر نکال دیا گیا ہے اور اسے شراب میں ایک لمبے عرصے تک ڈبو دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا، دراصل یہ سارا اہتمام اس لئے نہیں کرتے کہ جنسی کرنٹ کو فزوں تر کیا جا سکے۔ بلکہ یہ ایک ایسی اکسیر دوائی بن چکا ہے۔ جس کا جواب روئے زمین پر کہیں نہ ملے گا۔ اگر آپ ایک بار یہ پگ پی لیں۔ تو عمر بھر آپ کے جوڑوں میں گھٹیا یا ریح کا درد نہ ہو گا۔ چونکہ آپ ہمارے بہترین مہمان ہیں۔ اس لئے ہم نے بھی اپنی بہترین چیزیں آپ کو پیش کیں۔

شاید یہ بات آپ کو پتہ نہ ہو کہ پورے جنوب مشرقی ایشیا میں سوائے برصغیر پاک و ہند کے سانپ کا گوشت بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ سانپ کی گردن اتار دیتے ہیں اور پھر اسے بھون کر کھاتے ہیں۔ چنانچہ کوریا والوں کے نزدیک سانپ سے ڈرنا ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں کوئی مرغی سے ڈرے۔ بہرحال قوموں کے اپنے اپنے مزاج ہیں، اپنے اپنے حالات ہیں اور اپنے اپنے رواج ہیں۔

کوریا میں ایک اور "بوٹی" کو بہت بکتے پایا۔ اسے کوریائی زبان میں "انسام" کہتے ہیں۔ یہ بوٹی نما شے ہے جو پہاڑوں میں اُگتی ہے۔ کہتے ہیں جہاں یہ ایک بار اُگ گئے، وہاں سالوں تک گھاس پھونس بھی پیدا نہیں ہوتی۔ کوریا والے اس "بوٹی" کو ہر مرض کی دوا سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر اس کا مسلسل استعمال رکھا جائے، تو جسم میں بیماریوں کے خلاف زبردست قوت مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اس دوا کے سائنسی تجزیے کئے ہیں اور اُسے بہت کامیاب پایا

ہے۔ چنانچہ کوریا میں لوگ چلنے کے ساتھ "انسام" ضرور استعمال کرتے ہیں۔

اگر یہاں بچوں کے جسمانی ورزش کے مظاہرے کے متعلق کچھ نہ لکھا جائے تو کوریا کا دورہ مکمل نہ ہوگا۔ یہ جمناسٹک شو پیانگ یانگ اسٹیڈیم میں ہوا۔ اور اس نے پاکستانی وفد کے اذہان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جب یہ شو ختم ہوا تو ہم نے جناب بھٹو کو دور خلاؤں میں پُرخیال ڈوبے پایا۔ (بعد میں اپنے ہاں جو مظاہرہ شاہ خالد کی آمد پر ہوا تھا۔ وہ کوریا کے اسی مظاہرے کی صدائے بازگشت تھی۔ کوریا کے اساتذہ ہی نے ہمارے طلباء کو اس کے حساب جمناسٹک شو کی تربیت دی تھی۔)

اب ذرا کوریا والے جمناسٹک شو کی سرسری تفصیلات بھی سنتے چلیے۔ جب ہم اسٹیڈیم میں پہنچے تو لاکھوں افراد موجود تھے۔ کوریا ورکرز پارٹی کے کارکن، عوامی فوج کے جیالے مجاہد، طلباء، فیکٹریوں کے محنت کش، کسان اور خواتین، اپنے اپنے شعبہ جات کی مخصوص یونیفارم پہنے۔ اپنی اپنی جگہوں پر فروکش۔

جب مظاہرہ شروع ہوا، تو ہم نے ایک گھوڑا فضا میں بلند ہوتا دیکھا۔ یہ کوریا کا قومی نشان ہے۔ پھر نوجوانوں کا ایک دستہ گراؤنڈ میں داخل ہوا۔ اور تبھی اب کوریا کی تحریک آزادی کی جدوجہد کے مناظر شروع ہو گئے۔ ہمارے سامنے بیٹھے بچوں کے ہاتھ میں چھتری نما پنکھیاں سی پکڑی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ آرکسٹرا بج رہا تھا۔ چنانچہ ساز کے اشاروں پر یک بارگی میں وہ پنکھے بلند کرتے اور ہمارے سامنے نیا منظر بن جاتا۔ ان چھتری نما پنکھیوں کو وہ اس ترتیب سے پکڑتے کہ ہمارے سامنے پوری تصاویر بن جاتیں۔ توپیں چلنے کا سماں بندھتا فوجوں کی حرکت نظر آتی۔ اور اسی طرح جنگ کا مکمل پس منظر ابھر کر سامنے آجاتا۔ یہ کام تو اسٹیڈیم کی سامنے والی جانب بیٹھے دس بارہ ہزار بچے سرانجام دے رہے تھے۔ جبکہ اسٹیڈیم کے وسط میں جوانوں کا دستہ، بیلے ڈانس کی صورت میں، جدوجہد کی داستان کی عکاسی کر رہا تھا۔ پھر منظر بدلتے رہے اور گراؤنڈ میں ہر نئے منظر پر بچوں کے نئے دستے

نئی داستان رقم کرتے رہے ۔ کوریا کی تعمیر کی داستان ، ترقی کے کارنامے ، زرعی اور صنعتی پیداوار کے اعداد و شمار ، تعلیم ، فن اور کلچر میں ترقی ۔ ایک منظر یہ بھی آیا کہ کوریا ، ایسا ملک ہے جہاں عوام پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاتا ۔ کوریا والوں نے بتایا کہ پوری دنیا میں صرف ہمارے عوام ٹیکس سے آزاد ہیں ۔

ان بدلتے مناظر میں ، یادگارِ پاکستان کی شبیہ ابھری ۔ اور دوسرے سرے پر کوریا کا قومی نشان سامنے آیا ۔ دونوں جانب سے روشنی کا سفر شروع ہوا اور یوں اُجالے ایک دوسرے تک پہنچنے لگے ۔ پھر جناب بھٹو اور صدر کم ال سنگ کی تصویریں ابھریں ۔ ۔ ۔ ۔ اور پورا اسٹیڈیم تالیوں پر جھوم جھوم گیا ۔ کوئی بیس ہزار بچوں نے اس مظاہرے میں حصہ لیا

میرے ساتھ والی نشست پر ، انور سعید صاحب (پاکستانی سفیر متعینہ کوریا) کی صاحبزادی تشریف رکھتی تھیں مجھے کہنے لگیں ۔ پاکستان واپس جا کر ، آپ لوگ بھی ایسا ہی معاشرہ تخلیق کریں جیسا یہاں کوریا میں ہے ۔ میں نے ان سے پوچھا "کیا ، آپ کو کوریا پسند ہے؟" کہنے لگیں "جی ہاں ! میں یہاں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں ۔ اور ایک سال سے یہاں ہوں ، مجھے اس سوسائٹی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے ۔ یقین کیجئے ، یہاں کسی قسم کی گھٹن ہے ۔ نہ پابندی ، ہر فرد کو مکمل آزادی ہے ۔ ہاں لیکن آزادی سے مراد ، قتل ڈاکے یا چوری کی آزادی نہیں ، جو نام نہاد "آزاد" ملکوں میں پائی جاتی ہے ۔ بڑا ہموار ، متوازن اور مثبت معاشرہ ہے ۔ انسان کے اندر اگر ایک بھی صلاحیت ہے تو اُسے اُجاگر کرنے کا ہر فرد کو مکمل موقعہ دیا جاتا ہے ۔ ۔

. . . ۔ اور پھر یہاں اتنا تحفظ ہے کہ انسان کا ذہن خوف و ہراس اور خدشات کا شکار نہیں ہوتا ۔ مثال کے طور پر ہمارے ساتھ تعلیم پانے والے کوریائی طلباء و طالبات کو یہ فکر نہیں کہ کل اُن کا کیا بنے گا ؟ ملازمت ملے گی بھی یا نہیں ؟ کون کون سے دفتر کے چکر لگانے پڑیں گے ؟ کس کس سے سفارش کرانا پڑے گی ؟ یہ فکر نہیں کہ بیمار پڑے تو علاج کا کیا بنے گا ؟ چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں باپ کا کیا بنے گا ؟ شادی کے لیے رقم یا جہیز کہاں سے لائیں گے ؟ مکان کیسے بنا

پائیں گے؟ . . . . تو جناب جب یہاں کا انسان ان تمام دکھوں سے آزاد ہے تو پھر وہ ایجادات بھی کرے گا۔ ترقی بھی کرے گا اور آزادی کے اونچے معیار پر فائز بھی ہوگا . . . . . !"

خاتون اپنے تجربات اور افکار بتاتی رہی تھیں کہ مظاہرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ دوران مظاہرہ میں نے یہ بات شدت سے نوٹ کی، کہ کہیں سے کوئی فقرہ اچھالا جاتا ہے، نہ بے ہنگم نعرے لگائے جاتے ہیں۔ نہ بدمزگی کا مظاہرہ ہی کیا جاتا ہے۔ لاکھوں افراد بیٹھے ہیں۔ مگر نظم و ضبط کا یہ عالم ہے جیسے ایک ہی فرد بیٹھا ہو۔ اگر تالی بجتی ہے تو وہ بھی یکساں لے میں اور جب مظاہرہ ختم ہوا تو لاکھوں افراد کا یہ ہجوم صرف تیس منٹ میں صاف ہو گیا۔ نہ شور، نہ غل، نہ کسی کا دوپٹہ کھینچا گیا، نہ کسی کی جیب کٹی، نہ کوئی بچہ پاؤں تلے کچلا گیا۔ نہ پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا . . . . . ہر کوئی اپنی اپنی باری سے باہر نکلا۔ اور اپنی اپنی بس پر بیٹھ کر گھروں کو روانہ ہو گیا۔

ایک صاحب جو خاندان در خاندان جاگیردار ہیں۔ ہمارے ساتھ تھے۔ فرمانے لگے "یہاں کوئی ایسی جگہ ہو، جہاں چند لمحے "سکون" سے گزارے جا سکیں؟" عرض کیا "کسی فلم پر چلے چلتے ہیں یا کسی پارک میں چہل قدمی کر لیتے ہیں۔ یا پھر دریا قریب ہے کشتی رانی کر لیتے ہیں۔" کہنے لگے "میاں تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ چلو خیر۔" میں نے کہا "جناب مطلب خوب سمجھتا ہوں مگر جس "سکون" کی آپ کو تلاش ہے۔ اس کی خرید و فروخت یہاں نہیں ہوتی، وہ آپ کو وطن واپسی پر ہی میسر آپائے گا۔ یہ "کافر" لوگ ہیں۔ بڑے "گنہگار" ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ مگر عصمت نہیں بیچتے . . . ." وہ حضرت بڑا سا منہ بنا کر چل دیئے، یار لوگوں کے منہ کو خون تو ہانگ کانگ سے لگ گیا تھا۔ مگر وہاں سے جو اُڑے تو سیدھے یہاں آن پہنچے۔ یہاں انہیں "شکار" کیسے اور کہاں سے میسر آتا؟ وہ صاحب اور ان کے چند دیگر ہم مزاجی جی بھر کر بددعائیں دیتے پھرے۔ "سالے کمونسٹ۔ اپنے لوگوں کو آزادی نہیں دیتے۔ بس انہیں مشین بنا دیتے ہیں" چہ خوب؟ یعنی جہاں عورت اپنا جسم فروخت نہ کرے۔ وہاں آزادی نہیں ہوتی۔ دولت کے بل بوتے پر . .

ہر شے خریدنے کی آزادی۔ واہ۔ وا کیا خوب آزادی ہے۔

ہمارے وفد میں ہر قبیل کے لوگ شامل تھے۔ بہت سوچا کہ، محترمہ زاہدہ سلطانہ، محترم ملک مظفر خان پسر نواب امیر محمد خان۔ یا محترم سنجرانی صاحب، چین وکوریا سے کیا سیکھیں گے؟؟ مسعود محمود ڈائریکٹر ایف ایس ایف اور ایف آئی اے والے چودھری صاحب ان ممالک سے کیا فیض پائیں گے؟ بے چاروں کے چہرے منیر نیازی کے اس شعر کی تعبیر نظر آتے تھے۔

غیرت سر لئے دہر ہے — اور ہم ہیں دوستو . . . . . .

اب ذرا صدر کم ال سنگ کی جدوجہد کی کہانی بھی سنتے چلئے۔ ہمیں وہ گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں صدر کم پیدا ہوئے اور وہ جھونپڑا بھی دیکھا۔ جہاں ان کے اجداد رہتے تھے مزے کی بات یہ ہے کہ صدر کم کی دادی اور دادا اسی جھونپڑے میں ۱۹۶۲ء تک رہتے رہے۔ اسی جھونپڑے میں فوت ہوئے۔ یہ بزرگ آخری وقت تک کھیتی باڑی کرتے رہے گرچہ اُن کا پوتا ملک کا صدر ہو چکا تھا تاہم دادی اور دادا نے اپنا مکان بدلا، اور نہ پیشہ۔

ہمیں گائڈ نے بتایا کہ، صدر کم کے والدین جنگ آزادی میں شہید ہو گئے تھے۔ مگر اُن کے دادا نے حوصلہ نہ ہارا۔ یہ جھونپڑا دُور دراز سے آنے والے انقلابیوں کی پناہ گاہ تھا، انقلابی رات۔ دو رات یہاں قیام کرتے اور پھر اپنی منزل کو روانہ ہو جاتے۔

صدر کم کے دادا۔ ایک بڑے جاگیردار کے کھیتوں میں کسان تھے مگر انقلاب کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ بچپن کے زمانے میں صدر کم چین کے صوبہ منچوریا میں چلے گئے۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں واپس آئے تو دادا نے کہا "کم، کوریا ہماری ماں ہے اور دشمن کے قبضے میں ہے۔ ہمیں۔ ہمیں آزادی کی جنگ لڑنا ہے۔ اور اسی ملک میں انقلاب لانا ہے۔ تم اگر یہاں۔ ہو گے نہیں۔ تو اس دھرتی کو کیسے پہچانو گے"۔ صدر کم اس کے بعد منچوریا نہ گئے۔ بندوق ہاتھ میں لی اور فوج آزادی میں شامل ہو گئے۔ بیس سال کی طویل اور سخت جدوجہد کے بعد ۱۹۴۵ء میں کوریا کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ جاپانی سامراج کو زبردست شکست

ہوئی تھی۔

گانڈ نے بتایا۔ جب کوریا آزاد ہوا، تو صدر کم اپنی دادی، دادا کے پاس آئے اب وہ کوریا کے صدر تھے۔ مگر بوڑھے کسان کے گھر میں کوئی چارپائی نہ تھی۔ چنانچہ صدر کم، اسی چٹائی پر سوئے۔ جہاں وہ بچپن میں سویا کرتے تھے۔

صدر کم کے "لکھنے پڑھنے" کا سامان، ان کی جوتیاں، کپڑے، خاندان کے آلاتِ زراعت برتن اور دیگر اشیاء، اس مکان میں محفوظ کر لی گئی ہیں۔ کوریا کے نوجوان اس مکان کو دیکھنے آتے ہیں اور اپنے حوصلے دوچند کرتے ہیں۔ جب ہم مکان سے باہر نکلے تو میں نے گانڈ سے حکمران جماعت کے متعلق چند باتیں پوچھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ورکرز پارٹی کی ممبرشپ اس وقت تیس لاکھ روپے کے قریب ہے۔ اور صدر کم پچھلے چالیس سال سے پارٹی کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ تاہم ہر پانچ سال بعد پارٹی کے اندرونی انتخابات ہوتے ہیں۔ اور سارے عہدیدار منتخب ہوتے ہیں۔ صدر کم سے عقیدت کی بناء پر پارٹی کا کوئی فرد ان سے انتخابی مقابلہ نہیں کرتا۔

یہ دنیا بہت بڑی درسگاہ ہے۔ ایک ملک کا علم اور تجربہ دوسرے ممالک کے لئے بہترین سبق بن سکتا ہے۔ کوریا میں کسانوں کے لیے مختلف اصلاحات ہوتی رہیں۔ ان اصلاحات میں سے سب سے زیادہ مشہور اصلاح۔ "کسانوں کے قومی منشور" کے نام سے کی گئی۔ کسانوں کا قومی منشور، اپنا کر، کوریا کی ورکرز پارٹی نے اپنے ملک کی کسان آبادی کو، قدیم جاگیردارانہ نظام کے چنگل سے نجات دلا دی۔ جتنی سرکاری اراضی تھی، وہ بے زمین کسانوں کو دے دی گئی۔ اس طرح انقلاب کے ابتدائی مراحل کی تکمیل ہوئی۔ اور کچھ عرصہ بعد ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ مشترکہ کاشت کا نظام رائج کیا جا سکے۔

وزیر اعظم بھٹو اپنے ملک کے کسانوں کے متعلق بہت حساس رہتے ہیں۔ چنانچہ "کسانوں کا قومی منشور" ان کی گہری دلچسپی کا باعث بنا۔ انہوں نے اس دستاویز کا گہرا مطالعہ کیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس "چارٹر" سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں (چنانچہ واپسی

پر پاکستان میں بھی کسانوں کے قومی منشور کے نام سے دوسری اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ تمام سرکاری زمین کسانوں کو الاٹ کر دی گئی اور جاگیردارانہ نظام پر گہری ضرب لگائی گئی۔) کوریا میں ہم نے چاول کاشت کرنے کی بھی ایک مشین دیکھی۔ یہ مشین پانی میں دھان لگانے کے لئے بنائی گئی۔ اس میں چار ہارس پاور کا ایک انجن لگایا گیا ہے اور دو آدمی اس پر بیٹھ کر پچاس آدمیوں کے برابر کام کر سکتے ہیں۔ وفاقی وزیر زراعت عبدالرشید شیخ نے جب یہ مشین دیکھی تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ دوڑ کر مشین پر جا بیٹھے، اسے سٹارٹ کیا۔ اس کے کان مروڑے، ادھر اُدھر چلایا اور ہم سب نے کھیت کے منڈیر پر کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھا۔ شیخ صاحب نے بعد ازاں جناب بھٹو سے اس مشین کی تعریف کی۔ چنانچہ کوریا سے کچھ مشینیں تجرباتی طور پر منگوانے کا فیصلہ ہوا۔

یہاں چاول کی ایک نہایت عمدہ نسل کا بیج دریافت کیا گیا ہے۔ صدر کم نے ۲۰ بوریاں اس چاول کا بیج بطورِ تحفہ دیا۔ چنانچہ چاولوں کا یہ بیج بھی ہمارے ساتھ ہی سفر کرتا پھرا۔ وجہ یہ تھی کہ اپنے ملک میں چاول کی بیجائی شروع تھی۔ بھٹو صاحب چاہتے تھے، کہ اس چاول کو اپنے ساتھ ہی ملک لے جائیں تاکہ اس کی کاشت کی جا سکے اور مطلوبہ نتائج جلد از جلد برآمد ہو سکیں۔

کوریا کا یہ طوفانی دورہ اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ہم اپنے جذبوں کو نئی روشنی اور نئے اجالوں سے منور پا رہے تھے۔ کوریا کے انقلابی عوام کے نغمے، ہمارے ذہن میں، گرمی جوش اور ولولہ تازہ پیدا کر رہے تھے۔ اور یوں ہم ۲۶ مئی کو صبح ہی صبح، ایئرپورٹ پر پہنچے۔ کسانوں کی بیٹیاں ہمارے جہاز کے ارد گرد اپنا الوداعی رقص کر رہی تھیں۔ بڑی چاہت اور اپنائیت سے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی ٹولی میں لے جائیں۔ پھر رقص کرتے ہوئے ہم پہ پھول نچھاور کریں۔ عبدالوحید کٹپر اور سید حسین شاہ بخاری چونکہ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا انہوں نے "ہو جمالو" کی خوبصورت تان جمائی اور ہم سب نے، حسب مقدور ہاتھ پاؤں ہلا کر ساتھ دیا۔

ان خواتین کے ساتھ، ان کا ثقافتی رقص کرتے وقت میں نے محسوس کیا کہ ان کے رقص میں جنس کی نمائش کا عنصر شامل نہیں۔ نہ انہیں دیکھ کر لوگ ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے نظر آتے ان خواتین کے چہرے کسانوں کی سادگی اور سوشلسٹ نظام کی عظمت کے آئینہ دار تھے، یوں لگتا تھا جیسے اپنے گھر کی مائیں بہنیں بارات کی واپسی پر، ہمارے سروں پر پھول برسا رہی ہوں، تقریباً دس بجے صدر کم اور وزیر اعظم بھٹو تشریف لائے۔ الوداعی مصافحے اور معانقے ہوئے اور ہم انسانوں کی اس حسین بستی کی زندہ یادیں دل میں سمیٹے فضا میں بلند ہوئے۔ ہماری اگلی منزل پیکنگ تھی۔

جہاز کو چلے ابھی آدھ گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ جناب بھٹو جہاز کے پچھلے حصے میں تشریف لائے۔ انہوں نے باری باری سب سے خیریت دریافت کی۔ تاج محمد لنگاہ سے کہا "تم بڑے انقلابی بنتے ہو۔ میں تمہیں دورے پر اس لئے لایا ہوں کہ تم کچھ سیکھو۔ خاص کر ڈسپلن۔ دیکھو، صدر کم خدانخواستہ کوئی پیغمبر تو نہیں، مگر یہ سارا کمال پارٹی ڈسپلن کا ہے۔" تاج محمد لنگاہ نے نوکر شاہی اور پارٹی کے بعض عہدیداروں کی مخالفت کی۔ بھٹو صاحب اسی طرح بات چیت کرتے ارشاد راؤ تک پہنچے اور انہیں کہا "تمہیں اشتہار مل رہے ہیں؟" راؤ نے اثبات میں جواب دیا۔ بھٹو صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کبھی ہماری تصویر بھی لگا دیا کرو۔!" اور آگے بڑھ گئے۔ جہاز میں تقریباً آدھ گھنٹہ تک بھٹو صاحب نے وفد کے اراکین سے فرداً فرداً بات چیت کی۔

گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کا عمل ہوگا کہ جہاز نے۔ چین کے دارالحکومت پر ڈبکی لگائی چند ہی لمحوں بعد ہم، پیکنگ کے ایئرپورٹ پر تھے۔ وزیر اعظم ہواکوفنگ اور چینی وزیر خارجہ چینی حکام کے ساتھ۔ ہنستے مسکراتے آگے بڑھے۔ اور جناب بھٹو سے انتہائی پرجوش مصافحہ کیا۔ ایئرپورٹ پر، زبردست استقبالی ہجوم تھا۔ عوامی فوج آزادی کے چاق و چوبند دستوں کا مارچ، طلباء و طالبات۔ مزدوروں اور کسانوں کے نعرہ ہائے تحسین، رقص کرتی خواتین، رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس بچے۔ ہر جانب بہاروں کا راج۔ جب عوامی فوج آزادی کا آخری دستہ

چین میں استقبال کا ایک منظر

گزرا، تو میرے ذہن میں تاریخ کے نقوش ابھرے۔ یہ باہمت، خوش و خرم، جوشیلے نوجوان، ان لوگوں کے وارث ہیں، جنہوں نے عظیم ماؤ کی قیادت میں لانگ مارچ کیا تھا۔ عوامی فوج کے عظیم انقلابیوں نے، غازیوں، مجاہدوں اور سپاہیوں نے تقریباً دس ہزار میل پا پیادہ سفر کیا تھا۔ دشوار گزار پہاڑوں میں، جان لیوا میدانوں میں اور موت کی دلدلوں میں، یہ لانگ مارچ دنیا کی تاریخ کا سب سے طویل، سب سے مشکل اور سب سے زیادہ خطرناک لانگ مارچ تھا۔ راستے میں جگہ جگہ ان پر، دشمن پاگل بھیڑیے کی طرح جھپٹا مگر اس عظیم فوج نے حوصلہ نہ ہارا۔

ہاں یہی وہ سُرخ فوج ہے جس کی قیادت خود ماؤزے تنگ نے کی۔ اسی فوج نے جاپانی حملہ آوروں کی کمر توڑ دی۔ اسی انقلابی فوج نے چیانگ کائی شیک کو جڑ سے اکھاڑ کر پرے پھینکا اور اُسے زبردست شکست دی۔ اسی فوج آزادی نے ۱۹۵۲ء میں، کوریا کے محاذ پر، امریکیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ چینی فوج نے سامراجی فوجوں کو اتنا پرے دھکیل دیا کہ انہیں فائر بندی کرنا پڑی۔

اور یہی وہ فوج ہے جس نے نیفا کے محاذ پر جنرل کول کو تاریخی شکست دی۔۔۔۔ چین کی فوج آزادی، چین کی عظمتوں کی داستان ہے۔ اور ایسی فوج ہے جس نے ہندوستان کے مفتوح علاقوں پر بھی مارشل لاء نہ لگایا تھا! چین کی فوج، سیاسی فوج ہے۔ فوج میں شامل مزدوروں، کسانوں اور نوجوانوں کو سیاسی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اور فنی باریکیاں بھی سمجھائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس فوج نے آج تک کبھی ہتھیار پھینکے ہیں۔ نہ کبھی بغاوت کی ہے۔ نہ کبھی عوام پر بندوقیں تانی ہیں۔ یہ فوج سیاسی عمل کا، عوامی پہلو ہے۔۔۔۔۔ میں ان ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا، کہ ہوائی اڈے کی تقریبات ختم ہوئیں۔ ہم اپنی اپنی کاروں پر بیٹھ کر جناب بھٹو کے ہمراہ ریسٹ ہاؤس روانہ ہوئے۔

چین والے بہت سادہ لوگ ہیں۔ وزیر اپنی کاروں پر جھنڈا نہیں لگاتے۔ نہ اُن کے آگے پولیس کی دفاعی گاڑی چلتی ہے۔ نہ "ہوٹر" اور "سائرن" بجا کر عوام کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ نہ سڑکوں پر ٹریفک رُکتی ہے۔ نہ ناکہ بندی ہوتی ہے۔ نہ پولیس کی لٹھ بردار فورس کو سڑکوں پر کھڑا کیا جاتا ہے۔ بس جس نے جانا ہو۔ سیدھے سادے عام طریقے سے چلا جاتا ہے۔ کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔ نہ پروٹوکول کے "شاہانہ ضوابط" پر عمل ہی کیا جاتا ہے۔ اور نہ ایسی کسی "کارگزاری" کی ضرورت ہی پائی جاتی ہے۔ یہ "جھنڈے"، "ڈنڈے"، "ہوٹرا" اور "سائرن" انگریز کی نشانی ہیں۔ اس لئے ہمارا ہی مقدر ہیں۔

چین میں اب خاصا چین ہے۔ ٹھہراؤ اور سکون ہے۔ کوریا دیکھنے کے بعد، چین ایسے لگا

جیسے، محاذِ جنگ سے لوٹ کر کوئی ہیڈ کوارٹر میں پہنچے۔ ظاہر ہے ہیڈ کوارٹر میں محاذِ جنگ کی سی تیزی، حرکت اور شعلہ زائی نظر نہ آئے گی۔ وجہ یہ ہے کہ کوریا کا سب سے بڑا مسئلہ قومی بقا کی جدوجہد ہے، جب کہ چین اس منزل سے گزر چکا ہے۔ لہٰذا پیکنگ کی گلیاں محاذِ جنگ کا عالم دکھائی نہیں دیتا۔ آج کے چین کا محاذِ جنگ، اپنی معیشت کا منضبط پھیلاؤ ہے۔ پیداوار میں زبردست اضافہ اور طبقاتی جدوجہد کو عوام کی آخری پرت تک پہنچانا یہ آج کے چین کی جدوجہد کا بنیادی ہدف ہے۔ جس دن ہم چین پہنچے اُسی شب وزیرِ اعظم ہواکوفنگ نے، وزیرِ اعظم بھٹو کی شان میں عشائیہ دیا۔ یہ عشائیہ "گریٹ ہال آف دی پیپلز" میں ترتیب دیا گیا۔ یہ "عظیم عوامی ہال" موجودہ چین کا معجزہ ہے۔ "قدیم بادشاہوں کے محلات" کے عین سامنے یہ "عظیم عوامی ہال" تعمیر کیا گیا ہے اسے چین کے عظیم محنت کشوں نے رضا کارانہ طور پر تعمیر کیا۔ اور یوں "قدیم بادشاہوں" کے عین بالمقابل غریبوں اور محنت کشوں نے اپنی عظمت کا نشان تعمیر کیا۔

عظیم ہال کے دروازے پر وزیرِ اعظم ہواکوفنگ کھڑے تھے ان کے ساتھ وزیرِ خارجہ چیاؤ کوان ہوا اور دوسرے اعلیٰ چینی حکام کھڑے تھے۔ اس قافلے میں، چینی فوج آزادی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ جرنیل، مارشل چو تیہ بھی موجود تھے۔ مارشل چو تیہ، چینی فوج آزادی کے دیومالائی ہیرو ہیں۔ اُن کے متعلق میں نے پڑھ رکھا تھا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت سے قبل کسی صوبے کے فوجی کمانڈر تھے اور اس دُور میں بھی، انتہائی مشہور اور سب سے کم عمر جرنیل مانے جاتے تھے۔ جب سن یات سن کی قوم پرست حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا، تو مارشل چو تیہ یورپ کے دورے پر چلے گئے۔ جب اس دورے سے واپس آئے۔ اس وقت چین میں کائی شیک برسرِ اقتدار تھا۔ اور کمیونسٹوں کا قتلِ عام کر رہا تھا۔ جب مارشل چو تیہ کے چین میں واپس آنے کی خبر پھیلی تو پورا مغربی پریس پیکنگ میں آ پہنچ گیا۔ انہوں نے مارشل سے انٹرویو لینے کی درخواست کی اور پیشین گوئیاں کرنے لگے کہ مارشل چو تیہ، کائی شیک کی قوم پرست افواج کا ساتھ دیں گے چونکہ مارشل چو تیہ ایک انتہائی اعلیٰ اور امیر خاندان کے فرد تھے۔ لہٰذا لوگوں کا یہ خیال تھا کہ

وہ کمیونسٹ تحریک میں شامل نہ ہوں گے۔ مارشل چو تہہ نے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ گھر سے اپنا فوجی ساز و سامان لیا، گاڑی پر بیٹھے، اور سیدھے سرخ فوج کے کیمپ میں جا پہنچے، یہ لانگ مارچ سے قبل کا زمانہ تھا۔ سرخ فوج کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ مگر مارشل چو تہہ، صرف فوجی جرنیل نہ تھے، بلکہ تاریخ شناس بھی تھے وہ جانتے تھے کہ یہی زخم خوردہ فوج ایک دن ملک کو جاپانی سامراج کے شکنجے سے آزاد کرائے گی۔ یہی عوامی فوج ملک کو جنت نظیر بنائے گی۔ یہ عظیم انقلابی یہاں ایک ایسا معاشرہ تخلیق کریں گے جو اپنی مثال آپ ہوگا۔ جب لانگ مارچ شروع ہوا، تو عظیم ماؤ کی ہدایات کے تحت مارشل چو تہہ، عوامی فوج آزادی کے سپہ سالار بنے۔ یہ کم عمر جرنیل جو اپنی خاندانی جائداد، اور ناموس تیاگ کر، زمین پر آن سویا۔ اس نے انقلاب کا دامن تھاما تھا۔ اس وقت آنجہانی چو این لائی، سرخ فوج کے سیاسی ناظر تھے۔ اس دور میں چو این لائی نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے چین میں ان کی باریش فوٹو بھی دیکھی ہے۔ الغرض ماؤزے تنگ کے بعد، چین میں جس لیڈر کا سب سے زیادہ احترام ہوتا ہے وہ عظیم مارشل چو تہہ ہیں۔ یہ جرنیل جس کی قیادت میں سرخ فوج نے ہر محاذ پر فتح پائی، اپنی سادہ فوجی وردی میں ملبوس، عظیم ہال میں موجود تھا۔ چینی قد و قامت، گٹھا ہوا جسم، ہنستا، مسکراتا چہرہ، تندرست و توانا، چال ڈھال۔ ہاں مگر فوجی وردی پر کوئی تخصیص کا نشان نہ تھا۔ چین میں ہر فوجی کی وردی ایک سی ہوتی ہے۔ اس پر کوئی "جرنیل نشان" نہیں ہوتا۔ مارشل چو تہہ سے لے کر سپاہی تک سبھی ایک سی وردی پہنے نظر آئیں گے۔

جب وزیر اعظم بھٹو ہال کے بیرونی گیٹ میں داخل ہوئے تو اُن کا استقبال کیا گیا۔ جناب بھٹو تو چینی رہنماؤں کو جانتے ہیں لہٰذا پوری گرمجوشی کے ساتھ سب سے ملے۔ اور مارشل چو تہہ سے خیر و عافیت دریافت کی۔ ہمارے ساتھ فوجی وفد کے اراکین مارشل چو تہہ کو نہ پہچان پائے۔ اور کوئی پہچانتا بھی کیسے کہ مارشل نے "پی کیپ" پہن رکھی تھی نہ ان کی چھاتی پر "تمغے" آویزاں تھے۔ نہ ان کے آگے پیچھے، سلوٹ مارنے والوں کا لشکر ہی تھا۔ جرنیلوں کا یہ جرنیل

عام سپاہی کی وردی پہنے، ہمارے لئے مقامِ فکر بنا کھڑا تھا۔

جب ضیافت شروع ہوئی، تو ہمارے وفد کے ایک صاحب نے ترجمان کے ذریعے مارشل چو تہہ سے پوچھا۔ "جناب! آپ کے ہاں سب سپاہیوں کی سی وردی پہنتے ہیں تو آپ کے سپاہی، اپنے افسروں یا جرنیلوں کی شناخت کیسے کرتے ہوں گے؟" مارشل نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہمارے ہاں لوگ تمغوں اور رنگ برنگی وردیوں سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ اپنی جدوجہد اور کام کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔" مارشل چو تہہ کا یہ جواب ہمارے لئے کم حیرت انگیز نہ تھا مگر وائے افسوس کہ ہم حیرت نام کی کسی چیز سے آگاہ نہیں۔ سرکاری ضیافت، اچھی خاصی پریڈ سے کم نہیں ہوئی۔ ہر شے وقت پر پیش اور کچھ نہ کچھ مزید کھانے کی فرمائش پھر چین والے، میزبانی میں بہت سخت گیر واقع ہوئے۔ منع کرتے بھی آپ کو اتنا کچھ کھلا دیں گے کہ آپ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں گے۔ ضیافتی تقریبوں کے مخصوص طریقۂ کار کے مطابق، دوران ضیافت چینی وزیر اعظم ہوا کوفنگ اٹھے اور انہوں نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا جناب ہوا کو فنگ نے تیسری دنیا کے مظلوم عوام کی حمایت میں چینی موقف کو دہرایا۔ انہوں نے پاکستان کے ساتھ، چین کے انتہائی خصوصی تعلقات کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے سری لنکا کے اس مطالبے کی حمایت کی کہ بحر ہند کو آزاد علاقہ قرار دیا جائے۔ انہوں نے نیپال کے اس موقف کی بھی حمایت کی کہ نیپال کو امن اور سلامتی کا علاقہ قرار دیا جائے۔ چین کی اندرونی پالیسی کے متعلق جناب ہوا کو فنگ نے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ چین اس وقت اندرون ملک طبقاتی کشمکش کو بنیادی تضاد سمجھتا ہے۔ لہٰذا اندرون ملک ہم اس فکر کے خلاف مصروفِ جدوجہد ہیں۔ جو ہمارے انقلاب کا رُخ سرمایہ دارانہ راستے پر لگانا چاہتی ہے۔ تقریباً رات کے ساڑھے دس بجے یہ ضیافت کہیں جا کر ختم ہوئی۔ اور ہم اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس لوٹے۔ پیکنگ، صدیوں سے چین کا دارالحکومت رہا ہے۔ اس شہر نے تاریخ کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں یہاں قدیم شہنشاہوں کے محلات واقع ہیں۔ جہاں بیٹھ کر بادشاہوں نے صدیوں حکمرانی کی، ہم ان قدیم محلات کو ایک نظر دیکھنے گئے۔ ہزارہا چینی بچے، بوڑھے،

ہم اور ہزاروں، ان قدیم محلات کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ چینی لوگ سیر و تفریح کے بہت شائق ہیں۔ لہٰذا آتشدان تعمیر، یا دوسری قابل دید جگہوں پر، لاکھوں افراد جاتے ہیں۔ چھٹی والے دن بیوی، بچوں سمیت ان جگہوں کی سیر کی جاتی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء، مزدوروں کی گروپوں کی صورت میں یہاں تفریحی دوروں پر آتے ہیں۔

قدیم محلات، کوئی ایک محل نہیں، بلکہ محل در محل کا سا سلسلہ ہے، ہم نے وہ کمرہ بھی دیکھا۔ جہاں آخری چینی بادشاہ نے ۱۹۱۱ میں، تخت برداری کی دستاویز پر دستخط کئے تھے۔ اور اس کے بعد قوم پرست رہنما، سن یات سن نے اقتدار سنبھالا تھا۔

ان محلات ہی میں ایک جگہ ہمیں سنگ مرمر کا ایک پتھر نصب نظر آیا۔ جس پر سے پانی بہہ کر ڈھلوان پر آتا ہے۔ یہ ۳۰ فٹ لمبا اور تقریباً ۹ فٹ چوڑا پتھر ہے۔ جس پر اژدھے اور شیر کی تصاویر کندہ ہیں۔ اس کا وزن سات ہزار من سے اوپر ہے۔ یہ پتھر پیکنگ تک برف پر پھسلا پھسلا کر لایا گیا اور اس طرح سو میل تک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ پتھر پیکنگ پہنچا۔ ہزاروں گھوڑے اور مزدور اس کام پر لگے ہوں گے۔ اور سینکڑوں اس پتھر کو گھسیٹتے ہوئے مرے بھی ہوں گے۔ مگر وہ بادشاہوں کا دور تھا۔ اور انسان سب سے ارزاں تھا۔ یہیں ہم نے پانی کے قطروں سے چلنے والی گھڑی دیکھی۔ جس سے قدیم چینی وقت کا تعین کرتے ہوں گے۔ ان ہی محلات کے آخری سرے پر، ہمیں ایک جھروکہ بھی نظر آیا۔ اس کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہ "جادوئی جھروکہ" ہے۔ بادشاہ یہاں بیٹھ کر آرام کرتا تھا۔ جبکہ اس کے درباری دوسری جانب بیٹھتے تھے۔ اس "جادوئی جھروکے" کی دیواریں ایسی بنائی گئی ہیں کہ اندر سے کوئی آواز باہر نہیں جاتی۔ مگر باہر کی ہر بات اندر یوں آتی ہے جیسے دیوار نہیں کاغذ کا پردہ درمیان میں ہو۔ ہم نے اندر اور باہر کھڑے ہو کر اس جھروکے سے وابستہ داستان کو آزمایا۔ اور اُسے کافی حد تک درست پایا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں بادشاہ بیٹھ کر اپنے وزراء اور درباریوں کے آزادانہ خیالات چپکے سے سن لیتا تھا۔ اور اُسے پتہ چل جاتا تھا، کہ کون کیا کہتا ہے۔ درباری لوگ جھروکے کی

اس دوسری صفت سے بے خبر تھے لہٰذا وہ کھل کر باہم گفتگو کرتے۔ اور یوں اُن کے دل کا حال "قبل سبحانی" معلوم کر لیتے۔ میں نے آخری بار جھروکے کو دیکھا اور سوچا کہ اس "جادوئی" کمرے نے جانے کتنے لوگوں کی جان لی ہوگی۔ بے خبری کی بناء پر جانے کتنے امیر کبیر، عتاب شاہی کا شکار بنے ہوں گے۔ قدیم محلات کا رقبہ بہت وسیع و عریض ہے۔ لاہور کا شاہی قلعہ تو ان محلات کے صرف ایک کونے ہی میں سما جائے۔ یہاں ہر محل کے سامنے تانبے کی دیو ہیکل دیگیں پڑی تھیں جنہیں ہلانے کے لئے بھی سو، دو سو آدمی درکار ہوتے ہوں گے۔ مگر وہ شہنشاہوں کا دور تھا۔ آدمیوں کی کیا کمی ہوتی ہوگی۔ ان دیگوں میں تیل ڈال کر روشنی کا سامان کرتے ہوں گے لیکن ہر دیگ باہر سے کھرچی ہوئی نظر آئی۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ جب جاپانیوں نے یہاں قبضہ کیا تو انہوں نے دیگوں کو باہر سے "کھرچ" لیا۔ کیونکہ ان دیگوں کی بیرونی سطح پر سونا چڑھا ہوا تھا۔

ایک شام ہمیں پیکنگ کے ایک قریبی کمیون میں لے جایا گیا۔ کمیون کی آبادی کوئی ۶۰ ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ کمیون کا اپنا کالج، اپنا ہسپتال اور اپنی فیکٹریاں تھیں۔ ہمیں سب سے پہلے، ایک سادہ مگر خاصے کشادہ ہال نما کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں کمیون کے چیئرمین نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ کمیون کا صدر دفتر اور ہال تھا۔ اس کمرے میں کمیون کے انتظامی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک طرح سے "اسمبلی ہال" تھا۔ اس کمیون کی ساری قیادت ووٹ کے ذریعے منتخب ہوتی ہے۔ پارٹی کی جانب سے ہر کمیون میں پارٹی کا ایک دفتر بھی موجود ہے، جو پارٹی کی لائن، کمیون تک درست حالت میں پہنچاتا ہے۔ یہ کمیون قدیم یونانی شہری ریاستوں کی مانند، کافی حد تک خودمختار بھی ہیں اور ان میں براہِ راست جمہوریت کا تصور بھی پایا جاتا ہے یعنی اس ابتدائی سطح پر عوام، اپنے مسائل کے متعلق براہِ راست حصہ لیتے ہیں۔ یہ ابتدائی یونٹ سوشلسٹ سوسائٹی کی بنیادیں ہیں۔ چنانچہ انہیں بہت طاقت ور بنایا جاتا ہے۔ مرکزی پارٹی کی پالیسیوں پر بھی "ابتدائی یونٹ" کا بہت اثر ہوتا ہے۔ اہم قومی، معاشی اور سیاسی مسائل پر

ہر کمیون اپنا مستقد تجزیہ، صوبائی شاخ کو روانہ کرتے ہیں اور صوبے اپنے کمیونوں کی تجزیاتی رپورٹ مرکزی ہائی کمان تک پہنچاتے ہیں۔ مرکزی کمیٹی، یا پارٹی کی سالانہ قومی کانگرس ان ہی تجزیوں کی بنیاد پر اپنی غلطیاں درست کرتی ہے، خامیاں دور کرتی ہے اور اگلے سال کے لئے جدوجہد کا پروگرام از سرِ نو مرتب کرتی ہے۔ یعنی آپ نے محسوس کیا؟ چین میں چیزیں صرف اوپر سے نیچے نہیں آتیں بلکہ نیچے سے اوپر کی جانب حرکت بھی کرتی ہیں پارٹی کی بالائی قیادت اور نچلی سطح کے درمیان انتہائی گہرا رشتہ قائم ہے۔ پارٹی اور عوام کے درمیان انمٹ بندھن ہے۔ پارٹی عوام کے سامنے نہ صرف جوابدہ ہے بلکہ ان میں یوں موجود اور متحرک ہے جیسے پانی میں مچھلی، جسم میں خون یا پھر مادے میں توانائی۔

کمیون کے انتخاب ہر پانچ سال بعد ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ کمیون کا چیئرمین پارٹی کا ممبر ہی ہو۔ کوئی بھی فرد جو اس کمیون میں بستا ہے۔ کمیون کے انتخابات میں کسی بھی عہدے کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی ممبرشپ حاصل کرنا، جان جوکھوں کا کام ہے عمل کے طویل امتحان سے گذرنے کے بعد ہی ممبرشپ حاصل ہو سکتی ہے۔ اپنے ہاں کی طرح رواج نہیں کہ جب جی چاہا "پورے پورے قبیلے"، "ساری برادری" یا "ہزاروں ساتھیوں سمیت" کسی جماعت میں شامل ہونے کا اعلان داغ دیا۔ نہ ممبرشپ کی پرچی کاٹی، نہ منشور دیکھا اور نہ کسی عمل سے گذرے۔ جب جی چاہا، برسرِ اقتدار پارٹی میں آن گھسے، جب حالات ذرا پلٹے کسی نئی جماعت میں ہزاروں ساتھیوں سمیت جا شامل ہوئے۔ چین میں نہ یہ سیاست ہے اور نہ "ہزاروں ساتھیوں سمیت" در آنے والی جنس ارزاں ہی وہاں پائی جاتی ہے۔ چین میں انقلاب آئے ۲۵ سال سے اوپر ہو گئے ہیں۔ ۹۰ کروڑ کی آبادی ہے مگر پارٹی ممبرشپ صرف تین کروڑ!

خیر! ابھی ہم کمیون میں پہنچے ہی تھے کہ عوامی فوجِ آزادی کے دس بارہ ٹرک کمیون میں آن رُکے۔ ہم نے سوچا، ہماری حفاظت کو آئے ہوں گے۔ مگر تو یہ سب ہے جی؛ چاروں جانب سکون کی فضا بھی تو ہے۔ لہٰذا ہماری حفاظت کی کیا ضرورت! سپاہی لوگ، چھلانگیں مار کر ٹرکوں سے برآمد ہوئے۔ رائفلیں ایک جانب رکھیں۔ جانگیے اور بنیان پہن کر کھاد کے ایک بڑے ڈھیر کے سامنے جا کھڑے ہوئے، کچھ نے بیلچے سنبھالے، باقی جوانوں نے ٹوکرے لئے اور کھاد اٹھا اٹھا کر کھیتوں میں پھیلانے لگے۔ کمیون کے سربراہ نے بتایا کہ جس کمیون میں افرادی قوت کی کمی ہو۔ وہاں فوجِ آزادی کے جوان، درس گاہوں کے طلباء یا قریبی کمیون سے افراد مدد کو آتے ہیں۔ آج کل دھان لگانے کا کام زوروں پر ہے۔ چنانچہ عوامی فوجِ آزادی کے

چین کے ایک کمیون میں

جوان ہماری مدد کو آئے ہیں۔ یعنی چین کی فوج نہ صرف ایامِ جنگ کی فوج ہے بلکہ زمانۂ امن میں بھی عوام کے ساتھ مل کر، ملکی ترقی کے لئے کام کرتی ہے۔ دراصل چین میں فوج کو کوئی علیحدہ،

یا ماورا طبقہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اسے چینی معاشرے کا ایک فعال عضو بنایا گیا ہے۔ پوری معاشرتی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ جو معاشرے کے ہر دکھ درد میں پوری طرح شامل اور شریک ہوتا ہے۔

کمیون کے چیئرمین نے ہمیں دعوت دی کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق کمیون میں چل پھر کر جو چیز دیکھنا چاہیں دیکھیں، جب یہ اذنِ عام ہوا۔ یار لوگ کمیون کی گلیوں میں پھیل گئے۔ ہر گلی، نالی اور مکان کو ٹھونک بجا بجا کر دیکھا یوں ہی پھرتے پھراتے ہم کئی گھروں میں گئے، جہاں پر موجود خواتین نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اپنے گھر کے اندرونی حصے دکھائے۔ رہائش، کچن، صحن وغیرہ وغیرہ۔ یہ چھوٹے چھوٹے غریبانہ گھر تھے۔ اپنے ہاں کے دیہات سے کچھ ملتے مگر زیادہ صاف ستھرے اور ہوادار۔ ہر فرد کے چہرے پر رونق خوشی اور سکون کے تاثرات، کسانوں کی سادگی ان کے ہر مکان سے ظاہر۔ پتہ چلا کہ یہاں لوگ اپنے لئے خود بھی مکان بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے حکومت قرضہ مہیا کرتی ہے۔ مکان کے ساتھ ایک کنال آدھ کنال صحن کی جگہ بھی ملتی ہے۔ جہاں کسان چھوٹی موٹی سبزیاں لگاتے ہیں۔ گھر میں مرغیاں بھی دیکھیں۔ بہت سے گھروں میں چھوٹے، موٹے ریڈیو سیٹ بھی موجود تھے اور روزمرہ ضرورت کا ہر سامان۔

ہر کمیون کے پاس اپنی ٹرانسپورٹ ہے۔ جسے اجتماعی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ہر کمیون میں اس کی معاشی استعداد اور ضرورت کے مطابق ٹریکٹر، رکشے یا ٹرک وغیرہ نظر آئیں گے۔ ڈرائیوری کا کام اکثر و بیشتر خواتین کرتی ہیں، چنانچہ بیجنگ کی سڑکوں پر خواتین آپ کو بڑے بڑے ٹرک چلاتی نظر آئیں گی۔

ہر کمیون میں جانوروں کے فارم ہیں۔ یہاں ہزاروں جانور پالے جاتے ہیں۔ ان جانوروں کا دودھ، گوشت، گھی، مکھن وغیرہ کمیون میں بھی استعمال ہوتا ہے اور فالتو ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے کمیون یا شہروں میں بسنے والے استعمال کر سکیں۔ جس کمیون میں ہم گئے، وہاں بھی مرغیوں، بطخوں اور دیگر جانوروں کے فارم تھے، جنہیں یار لوگ بہت غور اور دلچسپی سے دیکھتے

پھرے : بیل فارم میں ایک ڈرم پڑا تھا۔ اس ڈرم کے نیچے ٹونٹی لگی ہوئی تھی۔ اس فارم کے انچارج نے ہمیں بتایا کہ یہ ڈرم خوراک سے بھر دیا جاتا ہے اور پھر اس ٹونٹی کے ذریعے ہر بیل کو خوراک باہر نکالی جاتی ہے۔ کرتے یوں ہیں کہ ٹونٹی کا سرا بیل کے منہ میں لگا دیتے ہیں اور بس ایک ہی جھٹکے سے ساری خوراک معدے میں۔

اس ٹونٹی کا اعجاز ہے کہ صرف چھ ہفتے میں بچھڑا ایک پورا، مکمل، جاندار اور باوزن بیل میں بدل جاتا ہے۔ کمیون کے چیئرمین نے ہمیں گندم کے لہلہاتے کھیت بھی دکھائے لیکن جب انہوں نے فی ایکڑ پیداوار بتائی تو بہت سے خاندانی جاگیردار منہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ اپنے تئیں یہ لوگ بڑے "ماڈرن زمیندار" کہلاتے ہیں۔ اپنی زمینوں پر مشین کا استعمال بھی کرتے ہیں مگر چین کے اجتماعی نظام کی پیداوار کا مقابلہ ہمارے ملک کا روبہ زوال جاگیردار کیا کرے گا؟

چیئرمین نے بتایا کہ ہر کمیون کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کمیون سے بازی لے جائے زیادہ سے زیادہ پیداوار کرے تاکہ مرکز سے امداد نہ لینی پڑے۔ انہوں نے بتایا جو کمیون موسمی حالات، زمین کی خرابی یا افرادی کمی کے باعث، دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں، مرکزی حکومت ان کو امداد دیتی ہے تاکہ وہ اپنی کمی پوری کر کے معاشرے میں اپنی صحت مند دوڑ کو جاری رکھ سکیں۔ انہوں نے کہا ہمارا یہ کمیون درمیانے درجے کا ہے۔ یہ نہ "غریب" ہے نہ "امیر" تاہم چین میں امداد کو بھیک لینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے لہٰذا کوئی کمیون نہیں چاہتا کہ وہ مرکز سے "بھیک" لے۔ ہم سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ہم مرکز کو دیں تاکہ جہاں کہیں کمی رہ گئی ہے وہاں ہماری امداد پہنچ سکے۔

بنیادی طور پر کمیون کا نظریہ یہی ہے کہ ملک کی زرعی آبادی کو صنعتی آبادی میں ڈھال دیا جائے۔ لہٰذا ہر کمیون میں فیکٹریاں اور صنعتیں لگائی جاتی ہیں۔ دیہات بسانے پر سکول اور کالج

کھولے جاتے ہیں تاکہ علم صرف شہروں تک محدود نہ رہ سکے یا پھر صنعت صرف چند مخصوص علاقوں میں ہی مرتکز ہو کر نہ رہ جائے۔ چینی لوگ بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ آنے والے زمانے میں یہ کمیون صنعتی یونٹ بن کر ابھریں گے اور اس طرح چین صنعتی معیشت کے دور میں داخل ہو جائے گا۔

چین والے بڑے فراخ دل لوگ ہیں۔ اپنی غربت چھپاتے ہیں، نہ دل کی بات۔ چین کوئی امیر ملک نہیں۔ امریکہ اور برطانیہ سے اس کا موازنہ کرنا حماقت ہوگی۔ وہ تو سامراجی ملک ہیں پوری دنیا کی دولت لوٹ کر اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ ان کی بلند و بالا عمارات کی بنیادوں میں ہم ایسے بہت سے غریب ممالک کا جسم دفن ہے لیکن ان ممالک کی ترقی کی ساری داستانوں کے باوجود ان کا نچلا طبقہ، چینیوں سے کہیں زیادہ غریب ہے۔ ان ممالک نے اپنے وسائل پر ترقی نہیں کی۔ ان کی ترقی کا راز دوسروں کی غربت اور پسماندگی میں پوشیدہ ہے۔ اگر آج سامراجی نظام کو ختم کر دیا جائے تو انہی ممالک کا فلک بوس محل دوسرے لمحے زمین پر آ سکتا ہے۔ چین میں پوری دنیا کی آبادی کا تیسرا حصہ بستا ہے۔ چین کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں لاکھوں افراد، بھوک اور قحط سے ہلاک ہوتے تھے۔ چین میں کوئی ایسا سال نہ گذرا ہوگا، جب خطرناک قحط نہ پڑا ہو۔ مگر آج کا سوشلسٹ چین خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہو چکا ہے۔ جہاں کبھی افیون اگتی تھی وہاں گندم اور دھان کی فصلیں لہلہاتی ہیں۔ جن کے مقدر میں چراغ کی روشنی تک نہ تھی مگر آج ان کے گھر بجلی کے قمقموں سے منور ہیں۔ انقلاب سے قبل ملک کی چالیس فیصد آبادی کے پاس، سر چھپانے کو کوئی جگہ نہ تھی مگر آج پورے چین میں ایک بھی فرد ایسا نہیں جو رات کو بھوکا سوتا ہو۔ انقلاب سے قبل تعلیم پر صرف امرا کی دسترس تھی۔ آج پورے چین میں ایک بھی بچہ ایسا نہیں جو علم کی روشنی سے محروم رہ جائے۔ ایک بھی شخص ایسا نہیں جو بے روزگار

ہو۔ کوئی بیمار ایسا نہ ملے گا جس کا علاج نہ مل سکتا ہو۔ پورے چین میں کوئی کسی کا نوکر نہیں کوئی کسی کے جوتے پالش نہیں کرتا۔ کسی کے برتن نہیں دھوتا۔ ۔ ۔ ۔ کوئی انسان دوسرے کا محتاج نہیں، کسی کا غلام نہیں۔ ۔ ۔ ۔ واقعی کتنا کافرانہ نظام ہے! کتنا ظالمانہ نظام ہے! کتنا جابرانہ نظام ہے! ہمیں بادشاہت منظور ہے۔ مغرب کی اخلاق باختہ جمہوریت قبول ہے۔ ہر بے ایمانی اور بیماری قبول ہے۔ مگر چین کا نظام۔ توبہ توبہ، ہم تو نظام مصطفےٰ کا نعرہ لگائیں گے۔ لوگوں کے ہاتھ کاٹیں گے۔ سرمایہ دار کی تجوری بھریں گے۔ جاگیردار کی شیروانی پہنیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھوک سے عوام کو ماریں گے۔ کیونکہ خدا بھوک ہی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ اللہ۔

تو جناب! صرف اسی پر چین کی کہانی ختم نہیں ہو جاتی۔ جہاں جہالت کے ڈیرے تھے آج وہاں علم کے دریا بہتے ہیں۔ جن کے اجداد کو لوگ افیونی اور سرکس کے مسخرے کہا کرتے تھے۔ آج ان کی اولاد نے اپنے علم اور ٹیکنالوجی کے زور پر ایٹم بم بنایا ہے۔ ہائیڈروجن بم کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ یہ اس ملک کی کہانی ہے جو ہم سے دو سال بعد آزاد ہوا تھا۔ آج کا چین ایک زمانے کے لئے روشنی کا مینار ہے۔ دنیا کی تیسری بڑی قوت ہے۔ اس کے پاس کوئی منڈی یا کوئی کالونی نہیں۔ پھر بھی عوام کے بل بوتے پر، ایک مساویانہ، اور برابری کے ماحول نے، ایک بہتر نظام حیات نے چین کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اگر چین اسی رفتار سے چلتا رہا، تو اس صدی کے آخر تک خدا جانے کیا حالت ہو۔ کتنی عظیم قوت بن جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ ماؤزے تنگ کی زندہ قیادت کا معجزہ ہے۔ اغوا، چوری، زنا، ڈاکہ، رشوت، ملاوٹ، قتل، مہنگائی، مقدمات، عدالتوں کی بھرمار، جیلیں۔ یہ ساری "ترقیاں" چین میں ناپید ہیں۔ بلکہ سارے سوشلسٹ ممالک میں ناپید ہیں۔ عدالتیں ہیں۔ سب سے بالائی عدالت کا نام "سپریم پیپلز کورٹ" ہے مگر ۹۹ فیصد مقدمات، کمیون کی سطح پر ہی نمٹا دیئے جاتے ہیں اور مقدمے کیا ہوتے ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ بیوی خاوند کے درمیان غلط فہمی یا ناچاقی کا مسئلہ۔ ۔ ۔ ۔ چار پانچ کروڑ کی آبادی پر ایک آدھ جج ہے۔ سو مہینوں جس کے پاس مقدمہ نہ آتا ہو گا۔

چین میں سائیکل کی فراوانی ہے پوری دنیا کی سائیکلیں ایک جگہ ..... اور چین میں تعداد پھر بھی کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ عام سپاہی کے پاس بھی سائیکل ہے اور ماؤزے تنگ بھی سائیکل پر چلتے ہیں۔ الغرض بڑا ہو یا چھوٹا، مرد یا عورت، استاد ہو یا شاگرد، سائیکل سب ہی چلائیں گے۔

شہر میں سفر کے لئے بسیں چلتی ہیں۔ مگر پٹرول سے نہیں، بلکہ بجلی سے ..... مگر بچت کا یہ عالم ہے کہ بس کے پیچھے لوہے کے رسوں سے، بس جتنا ہی ایک ڈبہ بھی باندھ رکھا ہے۔ چنانچہ اس پر بھی اتنی ہی سواریاں بیٹھ جاتی ہیں۔ بس کے ساتھ ساتھ، یہ ٹریلر بھی کھنچتا اور چلتا رہتا ہے۔ کرایہ میں بھی بالکل یہی طریقہ آزمایا جاتا ہے۔ اگر آپ کو شہر کے اندر کہیں دور جانا ہے، تو پھر سائیکل کی بجائے بس پر چڑھ جائیے۔ پورے ملک میں ریلوے کا جال بچھا ہوا ہے۔ چنانچہ دور دراز کا سفر ریلوے سے کیجئے۔ شہروں میں تفریح کے مراکز بنے ہیں۔ سینما ہال موجود ہیں۔ فلمیں دیکھئے۔ مگر "شیراں دے پتر شیر" یا "ایک حسینہ چالیس عاشق" طرز کی فلمیں نہ ہوں گی۔ زیادہ انسانی قسم کی فلمیں دکھاتے ہوں گے۔ ویسے شام کے وقت چینی عوام، سیر و سیاحت ضرور کرتے ہیں، شام کے وقت "گریٹ ہال آف دی پیپلز" کے سامنے ملحقہ "تی ین من" سکوائر پر ہزاروں افراد چہل قدمی کرتے دکھائی دیں گے۔ یہیں بچے سائیکل چلانے کی مشق بھی کر رہے ہوں گے۔

ایک اور بات جو ہمارے وفد کے ہر رکن نے نوٹ کی۔ کوریا اور چین دونوں جگہوں میں، ہم نے کسی جگہ، کسی مرد اور عورت کو بوس و کنار کرتے نہیں دیکھا بلکہ ہاتھ میں ہاتھ پکڑے ٹہلتے بھی نہیں دیکھا۔ ہم نے ان دونوں ملکوں میں لاکھوں، کروڑوں لوگ دیکھے۔ ان میں جوان جوڑے بھی ہوئے ہوں گے۔ ان میں بیویاں اور خاوند بھی ہوتے ہوں گے۔ ان میں ایک دوسرے کو چاہنے والے بھی ہوتے ہوں گے مگر سرِ راہ، یا عوامی جگہوں پر ہم نے ہانگ کانگ جیسا کوئی منظر نہیں دیکھا بلکہ اپنے ملک جیسا منظر بھی نہیں دیکھا ..... ہیں نا کافر لوگ!

جنس کا کھلا اظہار، صنعتی دور کی نشانی ہے چونکہ چین اور کوریا، بنیادی طور پر کسان آبادی کے

ملک میں لہٰذا اخلاقیات پر "مشرقیت" ہی کی چھاپ ملے گی، ویسا ہی جواب ملے گا۔ جب میں "مشرق" کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ایسا ملک ہوتی ہے، جس کی اکثریت زراعت سے وابستہ ہو۔ اسی طرح "مغرب" سے مراد ہے ایسا ملک جس کی اکثریت صنعت سے وابستہ ہو۔ چین اور کوریا اپنی بے پناہ ترقی کے باوجود ہنوز مشرق ہیں۔

ایک زمانے میں اپنے شفیق اور محترم استاد جناب شمیم سے ملنے کے دل ترستا تھا۔ شمیم صاحب گارڈن کالج راولپنڈی میں پڑھایا کرتے تھے اور ان کی نظرِ کرم کا نتیجہ تھا کہ ہمیں اپنی ذات کے تنگ دائرے سے باہر جھانکنے کا راستہ ملا۔ وہ چار پانچ سال سے چین میں تھے۔ ان کا ایڈریس بتایا اور چینی حکام سے درخواست کی کہ وہ مجھے شمیم صاحب سے ملوائیں۔ چین والے بات کو خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ بیچاروں نے شمیم صاحب کو ڈھونڈا۔ قومیتوں کے ہوٹل میں ہم دونوں کی ملاقات کا بندوبست کیا۔ وہاں کمرہ بک کر دیا تاکہ ہم استاد، شاگرد، سکون سے بات چیت کر سکیں۔ رات ۸½ بجے، مجھے لے جا کر شمیم صاحب سے ملوایا گیا۔ ایک زمانے بعد ملاقات ہوئی تھی، جی بھر کر باتیں ہوئیں۔ شمیم صاحب نے بتایا کہ بیجنگ میں پاکستان کا سفارت خانہ سب ملکوں سے بڑا ہے اور بیجنگ میں خاصے پاکستانی موجود ہیں۔ (ان میں سے بہت سے، ضیافت والے دن ہال میں ملے بھی تھے) حتیٰ کہ یہاں واحد غیر ملکی سکول، پاکستانیوں کی سرپرستی میں چل رہا ہے۔ اس سکول میں، دوسرے سفارت خانے والوں کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔ اس سکول میں ذریعہ تعلیم انگلش ہے (بعد میں بیگم نصرت بھٹو صاحبہ نے اس سکول کا معائنہ بھی کیا) دو تین سو بچے یہاں پڑھتے ہیں۔ شمیم صاحب نے بتایا کہ چین میں پاکستانیوں کی اتنی عزت ہے جتنی دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوتی ہوگی۔ باتیں کرتے کرتے شمیم صاحب نے کہا کہ ٹھہرو! میں تمہیں اپنے ایک شاگرد سے ملاتا ہوں۔ انہوں نے ایک چینی کو اندر بلوایا۔ ان صاحب کا نام ذہن سے اتر گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ چینی نام کیسے پیچیدہ ہوتے ہیں، بہرحال! یہ شاگرد اردو بہت روانی سے بولتے تھے۔ ہم تینوں نے خوب گپیں لگائیں۔ شاگرد نے باتوں ہی باتوں میں مرزا غالب کا کوئی شعر کمال برجستگی سے پڑھا اور میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

شمیم صاحب نے بتایا کہ یہ میرے ہم زاد ہیں۔ جہاں میں ہوں، وہاں ان کا ہونا لازم ہے۔ ملایت سے اتنے چپکے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔ میں دو تین سال تک یونیورسٹی میں جاتا رہا۔ جب گیٹ پر پہنچتا تو مجھے یہ منتظر کھڑے نظر آتے۔ پھر میرے ساتھ چل کر کلاس میں جاتے۔ پروفیسر صاحب ہنس کر کہنے لگے میں نے ہر روز کا حساب رکھا۔ سوچا آخر کوئی دن تو ایسا ہوگا کہ یہ مجھ سے پہلے کلاس میں ہوں گے۔ مگر تینوں پکے سالوں میں ہر روز اپنے انتظار میں اسی جگہ منتظر کھڑے پایا...... لہٰذا میں ہار گیا اور یہ جیت گئے۔ جبھی انہیں میں اپنا ہم زاد کہتا ہوں۔

پروفیسر شمیم سکون کا سمندر ہیں۔ اس دن بھی مجھ سے میری باتیں سنا کیے۔ حالانکہ میں یہ سوچ کر چلا تھا کہ ان سے چین کی باتیں سنوں گا۔ وہ تین گھنٹے جو ہمیں بیٹھنے کو ملے، غم دوراں اور غم جاناں کے قصوں کی نذر ہو گئے۔ مستقبل کی ملاقات کی امید دل میں لیے، کوئی گیارہ بجے، ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

بھٹو صاحب کو چین کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ ان کی ایسے عزت کرتے ہیں، جیسے وہ اپنے رہنماؤں کی کرتے ہیں۔ چین میں لوگ یہ تک جانتے تھے کہ یہ بھٹو صاحب کا "مزار" دورہ ہے۔ جبکہ ہمارے وفد میں شامل حضرات کی اکثریت اس بات سے بے بہرہ تھی! چینی نہ صرف بھٹو صاحب کو بخوبی جانتے ہیں بلکہ ان پر فخر بھی کرتے ہیں۔ بھٹو پہلے رہنما تھے، جنہوں نے ساری زندگی چین کا ساتھ دیا اور پاکستان کے لیے چین کا ساتھ لیا۔ پاک چین دوستی کی ابتدا بھٹو صاحب نے کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ نے چین کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ روس سے چین کا اختلاف کھل کر منظر عام پر آ گیا تھا۔ اس وقت چین کا نام لینا امریکہ کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ اسی جرم کی پاداش میں امریکہ نے بھٹو کو وزیر خارجہ کے عہدے سے نکلوایا تھا۔ بھٹو صاحب اکثر بتایا کرتے ہیں کہ ایک بار میں نے امریکی صدر کو کہا "جناب! آپ چین کی مخالفت نہ کریں۔ آپ ان لوگوں سے مل کر تو دیکھیں" امریکی صدر نے جواب دیا تھا "تم اپنے دماغ کا علاج کرانے کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ"..... یعنی نفرتوں کے اس سیاہ دور میں بھی جناب بھٹو نے چین کا ساتھ نہ چھوڑا۔ چنانچہ چین نے بھی ابتلا کے ہر دور میں پاکستان کی مدد کی ہے۔

اور حد سے بڑھ گئی ہے۔ ہمارے دورے کے دوران چیئرمین ماؤزے تنگ شدید بیمار تھے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ بھٹو چین جائیں اور چیئرمین ماؤزان سے ملاقات نہ کریں۔ ڈاکٹروں کی بندش کے باوجود چیئرمین ماؤزے نے جناب بھٹو کو اپنے پاس بلوایا۔ وہ آخری غیر ملکی مہمان تھے جو ان سے ملے، کیونکہ اس کے بعد چیئرمین ماؤ اس جہاں سے کوچ کر گئے)

بھٹو صاحب نے چیئرمین ماؤزے تنگ سے ہاتھ ملایا تو کہا: "جناب چیئرمین، آپ عظمتوں کے ہمالہ پر کھڑے ہیں اور تاریخ سکڑ کر آپ کے قدموں کی زینت بن چکی ہے"۔ ۔ ۔ ۔ چیئرمین ماؤزے نے وزیر اعظم بھٹو کا ہاتھ تھاما۔ وزیر اعظم ہوا کو فنگ کو اپنے پاس بلایا۔ دونوں کے ہاتھ، ایک دوسرے پر رکھ دیئے اور کہا "دونوں باہم متحد رہنا"۔ چیئرمین ماؤ، چونکہ بھٹو اور پاکستان کو بھی اتنا ہی چاہتے تھے جتنا چین کو، چنانچہ انہوں نے بستر مرگ پر بھی باہمی اتحاد کا اشارہ بھی کیا۔

بچپن میں دنیا کے سات عجوبے پڑھے تھے اور حضرت استاد کے ڈنڈوں کے سائے میں زبانی یاد بھی کئے تھے۔ دیوار چین ان سات عجوبوں میں سے ایک تھا اور ہمیں اکثر بھول جایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس خانہ خراب دیوار کی لمبائی چوڑائی وغیرہ پر ہمیں کئی بار استاد کے غصے کا شکار بننا پڑا۔ اس زمانے میں ہم سوچا کرتے تھے، جانے کیسے جھکی لوگ تھے۔ پہاڑوں میں دیوار کھڑی کر گئے نہ گرتی ہے، نہ تباہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ساری مصیبت ہمیں اٹھانا پڑتی ہے، کہ یاد کرتے پھریں، کب بنی تھی؟ کیسے بنی تھی؟ اور کہاں بنی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ اب کے جو چین پہنچے، تو وہی دیوار پھر سامنے، لیکن جب اسے جا کر دیکھا، تو یقین ہوا کہ بے چارے استاد ہم پر غلط ڈنڈے نہ برساتے تھے۔ واقعی دیوار چین یاد رکھنے کے لائق ہے۔ ان کے لئے بھی جنہوں نے دیکھی ہے اور ان کے لئے بھی جنہوں نے صرف پڑھی ہے۔

صبح ۱۰ بجے کے قریب ہم دیوار چین کو چلے۔ راستے میں سرسبز لہلہاتے کھیت اور کسانوں کے محنت میں ڈوبے جلوس دیکھے۔ ایک جگہ یونیورسٹی کے طلباء دھان لگانے میں مدد دے رہے تھے۔ چونکہ پانی کی کمی تھی، اس لئے ڈھو کر لا رہے تھے۔ جبکہ یونیورسٹی کی ایک طالبہ، گھوڑے کو

بالوں سے پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، مگر وہ کھیت میں سیدھا چلے ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس گھوڑے کے پیچھے، ایک طالب علم پوری طاقت سے ہل دبائے چل رہا تھا۔ یہ سب لوگ یونیورسٹی کے طلباء اور طالبات تھے۔ ہیں نا عجیب لوگ! اپنی ہر بات سے ہم اجنبیوں کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔ راستے میں بیل گاڑیوں کے قافلے بھی نظر آئے اور ایک زمانہ ماقبل انقلاب کا بوڑھا کسان بھی دیکھا۔ بزرگوار مع بیل گاڑی پر بھوسی لاد کر لے جا رہے تھے۔ بھوسی کے اوپر کروٹ لے کر لیٹے تھے۔ دستی حقے کی نے منہ میں تھی۔ نیم خوابیدہ حالت میں، حقے کی گڑگڑاہٹ کا ساز بجاتے بیل گاڑی پر ہچکولے کھاتے، اردگرد سے بے نیاز، اپنی منزل کو جا رہے تھے، یہ قدم چین کی باقی ماندہ نشانیاں ہیں نئی نسل تمباکو نوشی سے شدید نفرت کرتی ہے۔ محنت اور مشقت میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ خیر کوئی چالیس، پینتالیس میل سفر کرنے کے بعد، ہم دیوار چین کے عین سامنے جا رکے۔ دیوار چین کا یہ علاقہ، اپنے بلوچستان کے خشک پہاڑوں سے کافی مشابہ لگتا ہے لیکن چونکہ یہ علاقہ اتفاق سے چین میں ہے لہٰذا ٹنڈ منڈ پہاڑوں پر آپ کو قطار در قطار درخت لگے نظر آئیں گے جو موجودہ چین کا عجوبہ ہے۔ اس دیوار پر آپ کو عام فوٹوگرافر نظر آئیں گے۔ جو چینی لوگ یہاں سیر کو آتے ہیں۔ اگر وہ اپنا فوٹو بنوانا چاہیں تو ان فوٹوگرافروں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ ان سے فوٹو اترواتے ہیں، اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیتے ہیں۔ فوٹو صاف ہو کر ان کو گھروں میں پہنچ جائیں گے۔ معاوضہ بس واجبی سا ہے، خواہ پہلے ادا کر دیں یا بعد میں، کوئی فرق نہیں پڑتا،

یہ دیوار ہر دور میں زیر تعمیر رہی، ہر حکمران نے اس کی وسعت میں اضافہ کیا اور حملہ آوروں نے اسے کئی بار زبردست نقصان بھی پہنچایا۔ یہ دیوار بیجنگ کو بیرونی حملوں سے بچانے کے لئے تعمیر کی گئی تھی، پہاڑوں کے بیچوں بیچ اس طرح بنائی گئی کہ آج بھی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسے پہاڑ جن پر دو چار میل پیدل چلنا، ہم آپ کے بس کی بات نہیں، وہاں اتنے اتنے بھاری پتھر کیسے چڑھائے گئے ہوں گے؟ اور پھر پختگی کا یہ عالم ہے کہ آج بھی اس میں وہی مضبوطی پائی جاتی ہے۔ چوڑائی اتنی کہ دو، گھوڑ سوار بیک وقت، پہلو بہ پہلو اس پر دوڑ سکتے ہیں۔ ہر ڈیڑھ، دو

سو گز پر ایک بُرج بنا ہے، جہاں بیٹھ کر حملہ آوروں پر تیر و تفنگ کی بارش کرتے ہوں گے یا پھر یہاں کھڑے ہو کر پہرہ دیتے ہوں گے۔ یہ دیوارِ چین کے آٹھ صوبوں سے گذرتی ہے۔ اگر اس دیوار کو سیدھا کر دیا جائے تو اس کا سرا پیکنگ میں ہو گا اور دوسرا اسلام آباد میں۔ اگر کوئی بوئنگ طیارہ اس کی سیدھائی پر پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑے تو پورے سات گھنٹے اس دیوار کے دوسرے پر پہنچ پائے گا۔ کیونکہ اس کی لمبائی ۱۰ یا ۲۰ میل نہیں، بلکہ پورے ۳۵۰۰ سو میل ہے ....

دیوارِ چین پر پہنچے تو دوڑ لگانے کی سوجھی۔ دوڑنا تو کیا خاک تھا، تاہم لوگ تیز تیز چلنا شروع ہو گئے۔ ہمیں دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے، اگلے بُرج تک پہنچنا تھا۔ یہ بُرج خاصی بلندی پر تھا۔ جلد ہی ہمیں احساس ہو گیا کہ ایک ہی سانس میں اس چڑھائی کو عبور کرنا کارے دارد۔ لہٰذا کوئی یہاں گرا تو کوئی وہاں گرا۔ کسی کا پٹرول پچاس گز پر ختم ہوا۔ کوئی ۸۰ گز پہ ہانپ کر ایک جانب ہو گیا کوئی سو گز پر ساکت ہوا۔ کسی نے ڈیڑھ سو گز پر جگر کو تھام لیا۔ اور آخر کار یہ ریس، عنایت الرحمٰن عباسی ایم این اے جیت گئے۔ دوسرے نمبر پہ بلوچستان والے تیمور شاہ جوگیزئی آئے۔ اگرچہ مقبول پلوتوں دو جتوں والے ہیں لیکن "پہاڑی" گوئیلے ہیں۔ ہم "کنواروں" سے زیادہ توانا ہیں کہ ایک ہزارے کے باسی ہیں اور دوسرے بلوچستان کے۔ عبدالوحید کپٹر و بندہ صحرائی ہیں۔ بہت ہمت کے باوجود، ہمارے ساتھ ہی یہ ریس دونوں "بوڑھوں" سے ہار گئے۔ دیوارِ چین کے سفر میں، چینی سفیر متعینہ پاکستان ہمارے ہم سفر تھے۔ وہ ہم میں سے بہت سوں کے واقف تھے۔ لہٰذا بڑی شفقت سے قدیم و جدید چین کا تعارف کراتے رہے۔ دیوارِ چین سے واپسی پر "منگ ٹنگ" کا عجائب گھر دیکھنے گئے۔ یہ عجائب گھر کیا ہے، قدیم شاہوں کے تیرہ مقابر ہیں۔ ہر مقبرہ اپنے دور کی تاریخ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہاں ایک زیرِ زمین مقبرہ بھی دیکھا۔ جو تین سو فیٹ گہرائی پہ واقع ہے۔ نیچے روشنیاں بھی ہوئی ہیں، وہاں موجود ہیں اور بادشاہوں کی قبریں بھی۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ جب کبھی بادشاہ مرتا تھا تو اس کے ساتھ ہی اس کا ساز و سامان بھی دفن کر دیا جاتا تھا۔

حتیٰ کہ غلاموں کو بھی قتل کر کے وہیں دفن کر دیتے تھے۔ قدیم مصریوں کی طرح قدیم چینیوں کا بھی یہی نظریہ تھا کہ یہ بادشاہ لوگ پھر زندہ ہوں گے تو انہیں اپنے غلاموں، کنیزوں اور ساز و سامان کی ضرورت محسوس ہوگی۔ لہٰذا یہ شے ان کے قریب ہی دفنائی جاتی۔ تاکہ انہیں بوقت ضرورت کوئی پریشانی نہ ہو۔

چین میں جاگیردارانہ نظام اپنی انتہائی شدید صورت میں تھا۔ کسانوں کی زندگی اور ان کی محنت جاگیردار کے ایک اشارے پر ختم ہو جایا کرتی ہے۔ ان پرانے مقابر کے ایک کمرے میں اس دور کی ایک تصویری جھلک دکھائی گئی ہے۔ یہ تصاویر اس دور کے کسانوں کی مجبور زندگی کا عکاسی کرتی ہے۔ مثلاً ایک تصویر میں جاگیردار، تخت پوش پر ٹیک لگائے [illegible] تشریف فرما ہیں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح ہے۔ آنکھوں میں رعونت اور چہرے پر جلالی کیفیات ان کے سامنے بے چارے کسان ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ ان کے لباس تار تار، چہرے بھوک اور افلاس کا نشان، پاؤں ننگے ..... اور اسی عالم میں ان کی بیویاں اور بچے بھی کھڑے ہیں۔ یہاں اس دور کے بادشاہوں کی خوراک، لباس اور زیورات کے نمونے رکھے گئے ہیں۔ اس زمانے کے غلاموں اور رعایا کی خوراک کے نمونے بھی موجود ہیں۔ رعایا کی خوراک جنگلی بوٹیوں کی جڑیں، پتے یا چنے کی دال اور ساگ پات۔ جبکہ بادشاہوں کو زندگی کی ہر نعمت میسر۔ جب اس میوزیم سے واپس چلے تو میں نے اپنے گائیڈ سے کہا، بادشاہوں کے یہ مقابر اور ان سے وابستہ داستانیں، تو ہمارے ملک میں بھی بہت ہیں بلکہ بہت حد تک یہ داستانیں ایک دوسری سے ملتی جلتی بھی ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا اگر آپ ہمیں موجودہ چین کی تاریخ کا میوزیم دکھائیں جہاں کمیونسٹ پارٹی کی ساری تصاویری تاریخ موجود ہے۔ بڑے بڑے عظیم انقلابیوں کے لباس اور اسلحہ موجود ہیں جو انہوں نے دوران انقلاب استعمال کئے۔ عظیم شہیدوں اور غازیوں کے تعارف موجود ہیں۔ ہمیں زندہ تاریخ کی زندہ چیزیں دکھائیے ....

گائیڈ میری "تقریر" سن کر مسکرائے اور کہنے لگے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم آپ کو چین کی انقلابی

تاریخ کا میوزیم نہ دکھاتے۔ مگر افسوس ہے کہ مرمت اور صفائی کے سلسلے میں یہ میوزیم ایک ماہ کیلئے بند ہے۔ اس وقت ساری چیزیں اپنی جگہوں سے اکھڑی پڑی ہوں گی اور صفائی کے مراحل سے گذر رہی ہوں گی تاہم میں پھر بھی کوشش کروں گا۔ اگر ذرا بھی امکان ہوا تو آپ کو ضرور لے جایا جائے گا مگر افسوس کہ دوران قیام، ہم چین کی انقلابی تاریخ کے میوزیم کو صفائی وغیرہ کی وجوہات کی بناء پر نہ دیکھ سکے۔ اسے باہر سے دیکھ کر ہی واپس لوٹ آنا پڑا اور ہم نے اسے بھی غنیمت ہی جانا۔

ایک شام کو خبر پھیلی کہ کل "شنگ وا" یونیورسٹی جانا ہے۔ وزیر اعظم بھٹو پاکستانی وفد کی قیادت کریں گے۔ میرے لئے یہ خبر کسی مژدہ جاں فزا سے کم نہ تھی۔ میں ہر حال میں یہاں کی یونیورسٹی کا ماحول دیکھنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں کے طلباء اور اساتذہ سے ملاقات کی کوئی ترکیب نکلے۔ پتہ چلے یہاں کے انقلابی نوجوان کن خطوط پر کام کرتے ہیں۔ پاکستان میں طلباء اور مزدوروں کی سیاسی سرگرمیوں کا فکر میرے پاس تھا اور میں نے خود بھی ایک زمانے میں بحیثیت طالب علم ترقی پسند تحریک میں حصہ لیا تھا۔ چنانچہ میری شدید خواہش تھی کہ چینی یونیورسٹیوں کا ماحول دیکھوں۔

شنگ وا یونیورسٹی بیکنگ کی ورکشاپ میں مصنف
وزیر اعظم بھٹو کے پیچھے کھڑے ہیں۔

دوسرے دن صبح ہمارا پورا قافلہ "ژنگ وا" یونیورسٹی کو چلا۔ سب سے پہلے ہمیں ایک ورکشاپ میں لے جایا گیا۔ ورکشاپ میں دیوہیکل خراد نصب تھے۔ نوجوان طلبہ و طالبات ان خرادوں پر عملی تربیت لے رہے تھے۔ ہاتھ، منہ پر تیل کے نشان، مکینکوں کی سی وردی پہنے اپنے اپنے کام میں منہمک۔ اس ورکشاپ میں آنے کے بعد ہمارے وفد کے ایک رکن نے دوسرے کو کہنی ماری اور کہا "شاید ہمیں غلطی سے کسی فیکٹری میں لے آئے ہیں۔ یونیورسٹیاں بھلا ایسی ہوتی ہیں۔ میں نے یورپ کی یونیورسٹیاں بھی دیکھی ہیں۔ دوسرے صاحب نے بھی نیم رضامندی سے جواب دیا۔

ہو سکتا ہے، پروگرام کچھ اوپر نیچے ہو گیا ہے۔ شاید اس "فیکٹری" کے بعد یونیورسٹی لے جائیں"

تو یہ تاثر تھا یار لوگوں کا۔ ان کے خیال میں علم صرف ٹائی اور سوٹ پہن کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خرادوں اور مشینوں پر "مستری لوگ" کام کیا کرتے تھے۔ جامعہ پنجاب، اسلام آباد یا کراچی کے ہونہار طلبا، خراد مشین کاہے کو چلائیں گے! لہٰذا ہمارے بہت سے ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ خرادوں پر گھرر گھرر کرتے یہ لوگ "طالب علم" کیسے قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ یہ کوئی مزدور ٹائپ مخلوق ہے اور ہمیں غلطی سے اس جگہ لایا گیا ہے۔

ورکشاپ کے معائنے کے دوران جناب بھٹو نے ایک دو جگہ رک کر طلبا سے سوالات بھی کئے۔ یونیورسٹی ورکشاپ سے نکل کر ہم تعلیمی بلاک میں داخل ہوئے۔ وہاں پر موجود نوجوان نسل نے اپنے مخصوص چینی انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں ایک بڑے ہال میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں یونیورسٹی کے سربراہ نے بتایا کہ یہ یونیورسٹی ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں اس وقت ۹ ہزار کے لگ بھگ طلبا زیر تعلیم ہیں۔ سوال و جواب کی نشست میں مزید پتہ چلا کہ جب چین میں ثقافتی انقلاب کی لہر اٹھی تو اس سے پہلا پوسٹر اسی یونیورسٹی کی دیواروں پر مرتب ہوا تھا۔

پچھلے دنوں، چین کے وزیر تعلیم اور نائب وزیر اعظم تن سیاؤ پنگ نے اسی یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے چین کے موجودہ طریقہ تعلیم کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ موجودہ طریقہ تعلیم نے

ذہانت کو برباد کر دیا ہے اور طلباء کو پریشانیوں سے دوچار کر دیا ہے۔ اگر اسے نہ بدلا گیا تو چین علمی اور فنی بحران کا شکار ہو جائے گا۔ وزیرِ تعلیم کی یہ تقریر پیپلز ڈیلی میں بھی شائع ہوئی۔ اور پورے ملک میں بحث کا موضوع بن گئی۔ تن سیاؤ پنگ کے ہم خیال دانشوروں اور طلباء نے اسی یونیورسٹی کی دیواروں پر بڑا قدِ آدم پوسٹر لگایا۔ پھر تن ہیں آن سکوائر میں، موجودہ طریقۂ تعلیم کے خلاف پرامن ریلی بھی کی۔ اس کے جواب میں شنگ وا یونیورسٹی کے انقلابی دانشوروں اور طلباء نے، تن سیاؤ پنگ کی تجویز کے خلاف، شنگ وا یونیورسٹی میں پوسٹر لگانے۔ اس جانب سے بھی جوابی مظاہرہ ہوا جو تن سیاؤ پنگ کے حامیوں سے کئی گنا بڑا تھا۔

ہم نے وہ مشہورِ زمانہ دیوار بھی دیکھی، جس کے آمنے سامنے، دونوں جانب پوسٹر لگے تھے۔ ایک جانب تن سیاؤ پنگ کی حمایت میں اور دوسری جانب اس کی مخالفت میں۔ تاہم یونیورسٹی کے سربراہ نے بتایا "اب میدان تن سیاؤ پنگ کے مخالفین کے ہاتھ میں ہے"۔ جب ہم ان قدِ آدم پوسٹروں کو دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے تو ترجمان ان پوسٹروں کی عبارت بھی ہمیں ترجمہ کر کے بتاتے جاتے۔ ان میں سے کئی پوسٹر ایسے بھی تھے، جن میں ماؤزے تنگ پر تنقید کی گئی تھی، ثقافتی انقلاب کو مہم جوئی سے تعبیر کیا گیا تھا۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے خلاف دلائل کے نشتر چلائے گئے تھے۔ مگر قوتِ برداشت کا یہ عالم تھا کہ سب ایک ہی جگہ زیرِ تعلیم تھے۔ کوئی ہنگامہ اور کوئی توڑ پھوڑ نہ تھی۔۔۔۔۔۔ چین کی سب سے مقدس ہستی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا مگر کوئی گرفتاری نہ تھی۔ کوئی تادیبی کارروائی نہ ہوئی تھی۔ اس سے بڑی جمہوریت دنیا میں کہاں ملے گی۔

اب ذرا ماؤزے تنگ کے "طریقۂ تعلیم" کو بھی سمجھتے چلیے۔ ان کے اندازِ سیاست کو بھی ایک نظر دیکھتے چلیے کہ، وہ قوم کو کسی خاص مسئلے پر کیسے تعلیم دیتے ہیں۔ تن سیاؤ پنگ کے پوسٹروں کی ہی مثال لیجیے۔ جب یہ پوسٹر ایک دانش گاہ میں لگے، تو ان کے خلاف جوابی پوسٹر بھی لگے۔ یہ بات پھیل کر ملک کی ہر درس گاہ میں پہنچی۔ ان کی حمایت اور مخالفت میں اور پوسٹر لگنے شروع ہوئے۔ یہ بحث آہستہ آہستہ صنعتی یونٹوں میں پہنچی، دونوں جانب سے دلیل کے ہتھیار چلے اور فیکٹریاں بھی

پوسٹروں سے بھر گئیں۔ کیمپوں میں بحث مباحثے شروع ہو گئے اور جب پوری قوم "اس خاص مسئلے پر خوب بحث مباحثہ (وسیع گاشتی نہیں) کر چکی تو چیئرمین ماؤزے تنگ، ساری بحث کو سمیٹ لیں گے اور اس پوری جدوجہد کا کوئی نتیجہ برآمد کریں گے۔ پوری قوم، اپنی غلطیوں اور خامیوں کا احتساب کرتے ہوئے نئے نتیجے یا نئی انقلابی لائن کو پا سکے گی ۱۰۰ کروڑ افراد کے ذہنوں تک یہ لائن پہنچائی جائے گی۔ یعنی باشعور عوام کی مکمل شرکت، ان کے متحرک تعاون اور عمل کو ہر پالیسی میں شامل کیا جائے گا۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی اندرونی جمہوریت کا بنیادی نکتہ ہے۔

"عوام پر مکمل انحصار —— اور —— ہر مشکل میں ان سے رہنمائی"

چیئرمین ماؤزے تنگ کا قول ہے کہ انقلابی جماعتوں میں ہر وقت دو سوچیں متحرک ہوتی ہیں۔ ایک غلط اور دوسری صحیح۔ صحیح سوچ کی نشانی ہی یہ ہے کہ عوام اسے فوراً اپنا لیتے ہیں اور اس طرح وہ غلط سوچ پر غالب آجایا کرتی ہے۔ چیئرمین ماؤ کی قیادت میں پارٹی صحیح و غلط میں تمیز کرنے کے لئے ہمہ وقت عوام کے اندر اس طرح موجود ہے جیسے پانی میں مچھلی۔

چلئے دوبارہ شنگ ہوا یونیورسٹی کی دیواروں کی جانب چلتے ہیں۔ جب ہمارا دھیان تاریخ ساز پوسٹروں کی عبارت میں محو تھا، ہم نے ایک نوجوان طالبہ کو دیکھا، جو ایک پوسٹر کے قریب کھڑی اس کی عبارت کو اپنی کاپی پر نوٹ کر رہی تھی۔ وزیر اعظم بھٹو نے طالبہ سے پوچھا۔

بھٹو صاحب :۔ "خاتون! آپ کون سی بات نوٹ کر رہی ہیں"

طالبہ :۔ "جناب! یہ ایک انقلابی نظم ہے۔"

بھٹو صاحب :۔ "اس میں کیا خاص بات ہے؟"

طالبہ :۔ جناب! یہ انقلابی شاعری ہے اور ہماری یونیورسٹی کے ایک نوجوان کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں نئی نسل سے کہا گیا ہے کہ وہ تن سیاؤ پنگ جیسے ترمیم پسندوں کو کسی صورت میں قبول نہ کرے گی۔"

اس طرح کوئی تین گھنٹے تک ہم یونیورسٹی دیکھنے کے بعد ریسٹ ہاؤس واپس پہنچے۔ یہاں

تن سیاؤ پنگ کے متعلق بھی سنتے چلیے۔ تن سیاؤ پنگ ۱۹۶۶ء کے ثقافتی انقلاب کی زد میں بھی آئے تھے اور انہیں پارٹی کے عہدوں سے معطل کر دیا گیا تھا مگر بعد میں چو این لائی کے توسط سے وہ دوبارہ بحال ہو گئے۔ چو این لائی کی وفات کے بعد، تن سیاؤ پنگ دوبارہ تنقید کا نشانہ بنے۔ ان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ چیئرمین ماؤ نے ایک بار کہا تھا "اگر چین میں مارکسزم لینزم کو صحیح طور پر سمجھتا ہے تو وہ تن سیاؤ پنگ ہیں"۔ کہتے ہیں ایک بار ایسا ہوا کہ تن سیاؤ پنگ عین اس وقت اجلاس میں ہی سو گئے، جب چیئرمین ماؤ کسی انتہائی اہم مسئلے پر تقریر کر رہے تھے۔ تن سیاؤ پنگ نے بعد میں کہا تھا "میں سو جاؤں یا بیدار رہوں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتا ہوں، اس مسئلے پر چیئرمین ماؤ کیا کہیں گے۔"

اب ذرا چین کے نظامِ تعلیم کی بھی سنتے چلیے، جس پر بحث کی اتنی آندھیاں چلیں۔ چین کا پہلا طریقۂ تعلیم کچھ کچھ ہم سے ملتا جلتا تھا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان طلبہ کو داخلہ ملتا تھا، جو اچھے نمبر حاصل کرتے تھے۔ اسے "گریڈ سسٹم" کہا جاتا تھا۔ تاہم یونیورسٹی میں داخلے کا یہ طریقہ کار ثقافتی انقلاب کی زد میں آیا۔ یہ اعتراض کیا گیا کہ زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لئے شہر میں رہنا ضروری ہے۔ دیہات میں بسنے والے طلباء کے اسکول اور ادارے چونکہ کم تر ہیں۔ اس لئے وہاں شہر کے مقابلے میں تعلیمی سہولیات کم ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دیہات کے طلباء، مکمل وسائل نہ ہونے کے باعث، کم نمبر حاصل کرتے ہیں اور شہروں میں موجود طلباء سے پیچھے رہ جاتے ہیں (غور کیجئے! بالکل ہم جیسا مسئلہ ہے) لہٰذا بہترین درسگاہوں اور پسماندہ کالجوں کے طلباء میں فرق لازم ہے۔ یہ فرق اس وجہ سے نہیں کہ دیہات میں بسنے والے ۸۰ فیصد طلباء نالائق، کند ذہن اور غبی ہیں بلکہ اس کی وجہ صرف اور صرف تعلیمی سہولیات کی کمی ہے۔ ان دو مختلف صورتوں میں تعلیم پانے والوں نوجوانوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا، ناانصافی ہے۔ اگر گریڈ سسٹم چلتا رہا تو ایک وقت ایسا آجائے گا کہ سامراجی نظام کی مانند تعلیم پر صرف شہروں میں بسنے والوں کا قبضہ ہوگا۔ اس طرح ایک نیا طبقہ جنم لے لے گا۔ ایسا دانشور اور درمیانے درجے کا طبقہ جو زرعی آبادی کی کثریت سے ناواقف ہوگا، ان کے مسائل سے بے بہرہ ہوگا۔ لہٰذا وہ کتابی

فارموں کے تحت لوگوں کو ہانکنے کی کوشش کرے گا۔ ملک صرف اس وقت ترقی کر سکتا ہے، جب اس کا دیہی کسان علم اور ٹیکنالوجی سے روشناس ہو کمیون صرف اس صورت صنعتی یونٹوں میں بدل سکتے ہیں۔ جب کسانوں کے بچوں کو دیہات میں جانے پر تعلیم ملے نیز شہروں میں بسنے والے بچوں کو بھی محنت مشقت کے ماحول سے متعارف کرایا جائے۔

گریڈ سسٹم پر دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس طرح بچے علم تو سیکھ جاتے ہیں لیکن عمل سے واقف نہیں ہو پاتے۔ جب کوئی بی اے، ایم اے ٹاپ ڈگری لے لیتا ہے تو لامحالہ اس کے ذہن میں برتری کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ فطری طور پر وہ محنت کرنے والوں کو احمق، جاہل اور گنوار سمجھنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ عام آدمی سے رابطہ نہیں کر پاتا۔ نہ اس کی بات سمجھ سکتا ہے، اور نہ اپنی بات اُسے ہی سمجھا پاتا ہے۔ اسے بات کرنے یا بحث و مباحثہ کرنے کے لئے بھی، اپنے جیسے دانشوروں کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوان، فیکٹری یا کمیون جا کر، مزدوروں اور کسانوں کو اپنے علم کے مطابق چلانا چاہتا ہے مگر ان سے دور رہتا ہے۔ ان کے نزدیک نہیں جاتا۔ ان میں شامل نہیں ہوتا۔ ان کا حصہ نہیں بنتا اور بن ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس طریقہ تعلیم کو بدلنا بہت ضروری ہے۔ اس پرانے نظام کی جگہ جو طریقہ اب مروّج ہے۔ اس کے مخصوص خدوخال درج ذیل ہیں۔

چین میں میٹرک تک تعلیم لازم بھی ہے اور مفت بھی۔ لیکن میٹرک کے بعد کوئی نوجوان کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لے سکتا، خواہ وہ چین کے وزیرِ اعظم کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لازم ہے کہ متعلقہ طالب علم بتائے، وہ کس خاص شعبے میں پڑھنا چاہتا ہے مثلاً لٹریچر، علم طب، انجینئرنگ، زراعت یا ٹیکنالوجی۔ طلباء اور طالبات اپنا اپنا مخصوص شعبہ بتائیں گے۔ اب انہیں دو سال کے لئے براہِ راست ان کے متعلقہ شعبے میں بھیج دیا جائے گا۔ مثال کے طور پر زراعت والے کو کسی کمیون میں، فوج والے کو کسی فوج میں، ریلوے میں جانے کے خواہش مند کو ریلوے میں، ٹیکنیشن کو کسی فیکٹری اور طب والے کو کسی ہسپتال میں۔ یہ نوجوان طلباء و طالبات دو سال تک وہاں عملی کام کریں گے۔ اس خاص محکمے کی سب سے نچلی سطح پر ان سے کام لیا جائے گا۔ دو سال کے بعد

ان کا متعلقہ شعبہ، ان کے کام کی رپورٹ بنا کر یونیورسٹی کو روانہ کرے گا۔ اگر ان طلباء نے وہاں تسلی بخش طریقے سے کام کیا۔ متعلقہ شعبے نے یہ محسوس کیا کہ اس مخصوص طالب علم یا طالبہ میں صلاحیت، اور دلچسپی موجود ہے تو وہ شعبہ داخلے کی سفارش لکھ بھیجے گا۔ اگر، نوجوان نے ان دو سالوں میں کوئی ترقی نہیں کی، تو اس کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ نہ مل پائے گا۔ گویا اس طریقہ تعلیم کو اپناتے وقت چین والوں نے اپنی دیہی آبادی کو مدِنظر رکھا ہے۔ اس طرح انہوں نے علم اور عمل کو باہم یکجا کر دیا ہے۔ جو طالب علم، دو سال اپنے ہاتھوں سے مشقت کرے۔ ہل چلائے یا فیکٹری کا پہیہ گھمائے، تعلیم کے بعد، وہ اپنے مخصوص شعبے کے مسائل کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں کبھی، محنت کرنے والوں کے خلاف نفرت انگیز جذبات پیدا نہیں ہو سکتے وہ اپنے آپ کو عوام ہی کا ایک جزو سمجھے گا اور یوں چین کی ترقی کا پہیہ تیز تر طریقے سے متحرک رہے گا۔

تن ہسیاؤ پنگ کا اس طریقہ تعلیم پر اعتراض یہ تھا "طلباء کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے۔ پوری قوم کی ترقی، دو سال پیچھے چلی گئی ہے۔" وغیرہ وغیرہ چین میں طلباء کوئی ناز نخرہ نہیں کرتے۔ ناز نخرہ تو خیر یہاں کوئی بھی نہیں کرتا تاہم طلباء، طالبات کی سادگی قابلِ غور تھی۔ طالبات، میک اپ کی لغویات سے پاک صاف اور اجلی ستھری طلباء نئے نئے لباسوں کے تقاضوں سے ماوراء۔ ایک کوٹ اور پتلون، جنہیں استری کرنے کی ضرورت نہیں۔ سر پہ "ماؤ کیپ" اور بس بھئی ہو گئے تیار۔ چونکہ مرد، عورت یکساں لباس پہنتے ہیں۔ لہٰذا سامنے سے آپ کو لڑکی، لڑکے کی جلد پہچان نہ ہو گی۔ چینی مردوں کے چہرے پر داڑھی اور بال بس کچھ "تکلفاً" ہی اُگتے ہیں۔ لہٰذا بیس بائیس تک لڑکوں اور لڑکیوں کے چہرے میں کوئی خاص فرق نظر نہ آئے گا۔ ہاں جب آپ کی جانب ان کی کمر ہو تو پھر فوراً پہچان ہو جائے گی، لڑکی ہے یا لڑکا۔ کیونکہ سر کے پیچھے دو چھوٹی چھوٹی چوٹیاں نظر آئیں گی یہ لڑکی کی پہچان ہے۔ بصورت دیگر لڑکا ہے۔ چینیوں نے ہمیں وہ پناہ گاہیں بھی دکھائیں، جو ایٹمی حملے سے بچاؤ کے لئے تعمیر کی گئی ہیں۔ یہ پناہ گاہیں شہر کے گنجان آباد کاروباری مراکز میں تعمیر کی گئی ہیں تاکہ حملے کے وقت عوام کی اکثریت ان پناہ گاہوں میں پہنچ سکے۔ یہ سرنگیں، پورے شہر کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے اندر بجلی، ہیٹنگ،

اور باتھ روم کا انتظام ہے۔ نہ صرف یہ، بلکہ اشیائے ضرورت کی دکانیں اور اسٹورز بھی اندر موجود تھے۔ اندر ایک وسیع ہال بھی تھا، جہاں اس علاقے کے چیئرمین نے سرنگوں کے نظام پر روشنی ڈالی انہوں نے بتایا کہ یہ سرنگیں صرف ”تاشان گلی“ کے عوام کے لئے ہیں۔ اسی طرح پورے شہر کے ہر علاقے کی سرنگیں موجود ہیں۔ یہ ساری سرنگیں ایک دوسری سے ملا دی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک شہر تو اوپر آپ کے سامنے ہے اور دوسرا شہر زمین کے نیچے ہے۔ یہ سرنگیں اپنی مدد آپ کے تحت عوام نے خود تعمیر کی ہیں۔ یہ سرنگیں ایٹمی حملہ سے بھی مکمل طور پر محفوظ ہیں اور بوقت ضرورت چالیس لاکھ سے زیادہ لوگ ان سرنگوں میں کئی دن تک پناہ لے سکتے ہیں۔ ان سرنگوں کے اندر ایسے انتظامات بھی کئے گئے ہیں کہ عوام کو شہر سے باہر محفوظ مقامات تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ امن کے زمانے میں بھی ان سرنگوں کو اسٹورز وغیرہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ”تاشان گلی“ کی ان سرنگوں کی چوڑائی ۲ گز اور اونچائی ۲ گز ہوگی۔ چیئرمین نے ہمیں یہ بتا کر ہمیں مزید شرمندہ کر دیا کہ تاشان گلی کی یہ سرنگیں، خواتین نے بنائی ہیں۔ ۱۸۰ سو کے قریب خواتین جو ان دکانوں پر ”شاپس اسسٹنٹ“ کی ملازمت کرتی ہیں۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد، رضاکارانہ طور پر کھدائی کا کام کرتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں یہ سرنگیں مکمل ہو گئیں۔ اس طرح ہر علاقے نے اپنی مدد آپ کے تحت کام کیا۔ حکومت نے صرف سامان مہیا کیا۔ مثلاً سیمنٹ، لوہا، لکڑی وغیرہ ...... ہم نے اہل چین کو اور ان کے نظام حیات کو سلام پیش کیا! اور عقیدتوں کے جذبات دل میں لئے ”تاشان گلی“ سے واپس ہوئے۔ چین میں ائیرپورٹ پر ہی آپ کو پانچ قد آدم تصاویر نظر آئیں گے۔ کارل مارکس، اینگلز، لینن، سٹالن، ماؤزے تنگ۔ قومی تہواروں یا قومی دنوں کے موقعہ پر بھی آپ کو ہر سرکاری عمارت پر، ہر کمیون اور فیکٹری میں، ہر درس گاہ اور ہال میں ان پانچ شخصیات کے فوٹو [illegible] آویزاں ملیں گے۔ اہل چین ان شخصیات کی تہہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ اپنی ترقی، خوشحالی اور تعمیر کو ان عظیم ہستیوں کے نام نامی سے منسوب کرتے ہیں۔ یعنی انہیں اپنا پیرو تسلیم کرتے ہیں۔ اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان پانچ تاریخی شخصیات میں سے صرف ایک (یعنی چیئرمین ماؤ) چین سے متعلق ہے۔ جب کہ دو روس میں پیدا ہوئے،

ایک جرمنی میں اور ایک انگلستان میں یہ بات نشان دہی کرتی ہے۔ چین کی نظریاتی وسعت کی۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اہل چین، قوم پرستی کے تنگ تقاضے میں مقید نہیں بلکہ عالمی انقلاب پر گہرا ایمان رکھتے ہیں۔

چین میں قیام کے دوران چینی رہنماؤں اور پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں سے بین الاقوامی صورتِ حال پر بھی خوب بحث ہوتی رہی بالخصوص انگولا کے مسئلے پر۔ یاد رہے کہ انگولا میں چین نے وہاں کی فوج آزادی کی حمایت نہیں کی تھی بلکہ ان میں بھی۔ سی آئی اے کا تنخواہ اٹھانے والے سامراجی ٹولے کی حمایت کی گئی تھی چنانچہ عالمی سطح پر چینی خارجہ پالیسی طنز و تنقید کا نشانہ بنی بالخصوص یورپ میں چین کی خارجہ پالیسی کے اس پہلو پر شدید تنقید کی گئی۔ میں نے ان سوالات پر پارٹی کے مقتدر رہنماؤں سے بات چیت کی۔ ان کا موقف یہ تھا "روس اور امریکہ دونوں سامراجی ملک ہیں۔ دونوں انقلاب دشمن ہیں۔ دونوں کی پالیسیاں یکساں ہیں۔ دونوں اپنے اپنے حلقۂ اثر کو بڑھانے کے لئے تیسری دنیا میں سازشیں کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی باہمی کش مکش کوئی انقلابی کشمکش نہیں۔ جہاں امریکہ مزید قیام نہیں کر سکتا۔ وہاں روس "انقلاب" لے آتا ہے اور جہاں سے روس کو ہٹنا ہو۔ وہاں امریکہ "ردِ انقلاب" کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ہم خارجی صورتِ حال کو اس نکتہ نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔"

یہ خیالات پارٹی کے ایک انتہائی اہم عہدیدار کے تھے۔ یہ عہدیدار چیئرمین ماؤزے تنگ کی وفات کے بعد گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ بہتر ہے ان کا نام لکھنے سے گریز کروں گا۔ بہر حال یہ تنہا فرد کے خیالات نہ تھے بلکہ پوری کمیونسٹ پارٹی کی سوچ ان خطوط پر ہی ہوگی۔ جبھی ان کی خارجہ پالیسی میں انگولا اور چلی جیسے نازک مقامات آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ چین اور روس کی کشمکش کے باعث چین والے روس پر کچھ زیادہ ہی برستے ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی نے بھی غلطیاں کی ہوں گی پہلے انہیں ترمیم پسندی کی گالی دے دیجئے تاہم سامراجی نہ کہئے کہ بہرحال وہ سامراجی نہیں ہیں۔ تاہم یہ مسئلہ خالصتاً نظریاتی ہے۔ اس پر سیر حاصل بحث کی بھی گنجائش ہے اور اتفاق یا اختلاف کی بھی۔

ایک صبح ہمیں "کیپٹل اسٹیل مل" کے معائنے کی دعوت ملی یادیں ہم تمام اپنی گاڑیوں پر سوار ہوئے اور فوراً ہی مل کو جالیا یہ سٹیل مل پیکنگ سے ۱۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے چین میں ان گنت سٹیل ملز ہیں اور سب کی سب ان کی اپنی بنائی ہوئی ہیں کیپٹل سٹیل مل، انقلاب سے قبل لگائی گئی تھی اس وقت اس کی پیداوار پونے تین لاکھ ٹن سالانہ تھی فی الوقت ساڑھے بارہ لاکھ ٹن سالانہ پیداوار ہے اور چالیس ہزار سے زائد مزدور اس مل میں کام کرتے ہیں۔

مل کے نوٹس بورڈ پر پوسٹر لگے تھے۔ ترجمان سے پوچھا "بھائی، ذرا پڑھ کر بتانا" پتہ چلا وہی تو "سیاؤ پنگ والی بیماری" یہاں بھی پہنچ چکی ہے۔ اس فیکٹری کے مزدوروں نے پوسٹر لگا رکھا تھا۔ جس میں طبقاتی جدوجہد تیز کرنے کو کہا گیا تھا۔ ہم نے فیکٹری کے چیئرمین سے چلتے چلتے پوچھا "جناب، چین میں انقلاب آئے ۲۵ سال ہونے کو آئے ہیں۔ آپ کا انقلاب گہرا اور ہمہ گیر ہے اور زمانے کے لئے قابلِ مثال کیا یہاں ابھی تک طبقات موجود ہیں؟ چیئرمین نے دو ٹوک جواب دیا "جی ہاں، اگرچہ بورژوازی ختم ہو چکا ہے مگر اس کی سوچ ابھی باقی ہے اور نت نئے بہروپ بھر کر یہ سوچ اپنا اظہار بھی کرتی ہے۔ پارٹی کے اندر اور باہر اس سوچ پر صرف طبقاتی شعور کے حوالے ہی سے قابو پایا جا سکتا ہے لہٰذا طبقاتی جدوجہد ہماری سب سے بڑی معروضی ضرورت ہے۔

فیکٹری کے معائنے کے دوران ایک پاکستانی ساتھی نے مجھے بتایا "سنا ہے چیئرمین ماؤ کافی علیل ہیں۔ مادام چنگ ان کے نام پر پارٹی کا سارا کام کر رہی ہیں۔ اس بات پر پارٹی میں رنجش کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔" میں نے اس خاص موضوع پر بہت سے چینی ساتھیوں سے بات چیت کی۔ بحث مباحثے کے دوران "شنگھائی گروپ" کے متعلق بھی کافی مفید معلومات اکٹھی کیں پتہ چلا کہ شنگھائی سے پولٹ بیورو کے چار ممبران ہیں۔ مادام ماؤ زے تنگ خود بھی شنگھائی سے تعلق رکھتی ہیں۔

چین میں جو صورتِ حال آج ابھر کر سامنے آئی ہے۔ یہ کوئی نئی اور انوکھی نہیں۔ اس صورتحال کے پورے پورے آثار پہلے سے موجود تھے۔ معروضی اسباب اور شرائط موجود تھیں چیزوں نے اپنے منطقی نتیجے پر بہرحال پہنچنا تھا۔ چنانچہ چیئرمین ماؤ کی وفات کے بعد پارٹی کی اندرونی جدوجہد

کھل کر سامنے آگئی ہے۔ نظریاتی اختلاف کی لہریں، جو پہلے سطح کے نیچے رواں دواں تھیں، اب اپنی پوری شدت سے سطح پر نظر آنا شروع ہو گئی ہیں۔ تاہم چین کی کمیونسٹ پارٹی کی نظریاتی اساس بہت گہری ہے۔ اس کی جدوجہد بہت طویل اور ہمہ گیر ہے لہٰذا پارٹی اپنے موجودہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی بخوبی اہلیت رکھتی ہے۔

چین کی زرعی ترقی بھی ایک نظر دیکھتے چلئے۔ اس وقت چین میں سات ہزار پانی ذخیرہ کرنے کے تالاب ہیں خشک سال کے موسم میں ان تالابوں سے پانی کی کمی پوری کی جاتی ہے۔ ٹیوب ویل کے ذریعے بھی وسیع پیمانے پر آبپاشی کی جاتی ہے۔ کم و بیش ۱۵ لاکھ ٹیوب ویل مختلف مقامات پر نصب ہیں۔ چینی پانی کو اپنی سب سے بڑی قومی دولت سمجھتے ہیں۔ یہاں دریا، نہریں اور نالے، اپنی مرضی سے نہیں بہہ سکتے۔ چنانچہ ان پر ہر مناسب جگہ ڈیم تعمیر کئے گئے ہیں اگر سارے بندوں کو یکجا کر دیا جائے تو ان کی لمبائی ۸۰ ہزار میل بنتی ہے۔ پورے چین میں نہری نظام کا زبردست جال بچھا دیا گیا ہے۔ ان نہروں کی لمبائی ۵۰ لاکھ میل بنتی ہے۔ ثقافتی انقلاب کی جدوجہد کے دوران "سرخ جھنڈا" نامی ایک نہر کھودی گئی تھی۔ اس نہر کی لمبائی ۱/۲ ۹ ہزار میل لمبی ہوگی۔ چنانچہ زبردست محنت، پانی کی بہم رسانی اور بجلی کی سہولیات کی وجہ سے چین کی قابل کاشت زمین میں دگنا اضافہ ہو چکا ہے۔ وہ علاقے جو صدیوں سے بنجر اور ویران پڑے تھے۔ آج سرسبز ہیں کوہ ہمالہ کی چین والی جانب، ہوائی جہاز پر اڑتے ہوئے بھی آپ کو پہاڑوں کے پہاڑ، سرسبز کھیتوں میں تبدیل نظر آئیں گے۔ چین والوں کا مقولہ ہے "زراعت میں تاچائی سے سیکھو"۔ تاچائی دراصل ایک چھوٹے پیمانے کا کمیون ہے۔ جسے تاچائی کے ساڑھے چار سو افراد نے فطرت کو تسخیر کر کے آباد کیا۔ یہ کمیون چینی جدوجہد کا ماڈل کمیون ہے۔

چین میں آخری شام تھی۔ وزیر اعظم پاکستان نے چینی رہنماؤں کو جوابی ضیافت دی۔ یہ جوابی ضیافت بھی، عوامی ہال ہی میں ترتیب دی گئی۔ وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو، ہال کے گیٹ پر معزز چینی رہنماؤں کا استقبال کر رہے تھے۔ جب چینی وزیر خارجہ تشریف لائے تو وہ

تنہا تھے، ان کی بیگم ساتھ نہ تھیں۔ بھٹو صاحب تو ہمارے چینی مہمانوں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ لہٰذا وزیر خارجہ سے کہا "آپ کی بیگم صاحبہ تشریف نہیں لائیں؟" وزیر خارجہ ہر لمحہ ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔ جناب وزیراعظم کے اس استفسار کو حسین طریقے سے ہنس کر ٹال گئے اور کوئی جواب نہ دیا کھانے کی میز پر جناب بھٹو ٹوسٹ تجویز کرتے ہوئے، جب وزیر خارجہ کے قریب سے گزرے تو دوبارہ کہا

"آپ اپنی بیگم صاحبہ کو ہماری دعوت میں کیوں نہیں لائے" کامریڈ چیاؤ۔ تب بھی چپ ہی رہے جب الوداعی معانقہ ہو رہا تھا اس وقت پھر وزیر اعظم پاکستان نے کہا "آپ اپنی بیگم صاحبہ کو بھی ہماری طرف سے آداب کہئے گا۔ ان کی صحت تو ٹھیک ہے نا" مسٹر چیاؤ نے اس وقت آہستہ سے بتایا "جناب، وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، انہیں کام پر جانا تھا لہٰذا وہ یہاں نہ آسکیں میں ان کی جانب سے معذرت خواہ ہوں"......یعنی انتہائی اہم شخص کی بیگم اس دعوت پر تشریف نہ لا سکیں کیونکہ انہیں اپنی ملازمت پر جانا تھا۔ جب کہ ہمارے سیکشن افسروں تک کی بیگمات سینکڑوں طرح کے پرفیومز میں نہائی، دعوت پر موجود تھیں یہ چھوٹا سا واقعہ اہل چین کے احساس فرض کی نشاندہی کرتا ہے۔ وزیر اعظم پاکستان کے ذاتی فوٹو گرافر ضیغم زیدی چونکہ اس وقت وزیر اعظم کے قریب تھے۔ اس لئے وہ اس واقعے کے راوی ہیں۔

ضیافت سے قبل، ہمیں وزارت خارجہ والوں نے بتایا کہ چینی بڑے "شرمیلے اور سادہ" لوگ ہیں ان کا طریقہ کار مغرب سے مختلف ہے جب وہ ٹیبل پر آپ کے ساتھ بیٹھیں تو انہیں کھانا کھلاتے وقت آپ پوری پوری میزبانی کیجئے چونکہ یہ دعوت ہم دے رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی اپنی ٹیبل پر بیٹھے مہمانوں کو سنبھالنا ہوگا ان کے آگے چیزیں رکھنا ہوں گی۔ دھیان رکھنا ہوگا کہ کہیں ان کی پلیٹ تو خالی نہیں۔ وہ یورپی لوگوں کی طرح خود بخود ہر شے کی جانب ہاتھ نہ بڑھائیں گے۔ خالص مشرقی لوگ ہیں۔ آپ یوں سمجھئے، جیسے آپ کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہے اور آپ اسے کھانا کھلا رہے ہیں۔ ضیافت کے دوران ہلکی پھلکی گپ شپ بھی چلائیں اور مہمانوں کا خیال بھی رکھیں۔

یہ بات کس قدر صحیح تھی۔ اہلِ چین کسانوں کی سادگی کا نمونہ ہیں۔ کھانے کے دوران، ہمیں اپنے مہمانوں کی جانب پورا پورا دھیان رکھنا پڑا۔ انہیں کئی کئی بار کہہ کر چیزیں کھلانی پڑیں۔ اس سے قبل جب چین والوں نے ضیافت دی تھی تو بس یوں ہی ہنستے مسکراتے کامریڈوں نے ہمیں اتنا کچھ کھلا دیا تھا کہ الاماں۔ اہلِ چین مہمان نوازی کے معاملے میں دنیا بھر میں منفرد ہیں۔ آپ بے شک انکار کرتے پھریں، وہ آپ کو "بس تھوڑا سا لیجئے" کہہ کر کھلاتے رہیں گے مگر خود کھانے کے معاملے میں سخت "پرہیزی" واقع ہوئے ہیں۔

ضیافت کے دوران تقاریر کا سلسلہ چلا۔ جناب بھٹو کی آواز میں ایسی گھن گرج تھی جیسے وہ اپنے ملک میں ناصر باغ میں یا نشتر پارک میں موجود ہیں۔ انہوں نے بین الاقوامی سیاست کا تجزیہ کیا تیسری دنیا کے اتحاد پر روشنی ڈالی۔ تالیوں کی گونج میں فلسطین اور کشمیر کی آزادی کی بات کی۔ ہندوستان کے کونسلیٹ، کشمیر کے ذکر پر دعوت سے اٹھے اور واک آؤٹ کر گئے۔ وزیرِ اعظم ہوکوفنگ نے پاکستان کی مکمل حمایت کا اعلان کیا۔ فلسطین اور کشمیر کی آزادی پر چین کے موقف کو دہرایا۔ انہوں نے کہا ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جب فلسطینی اور کشمیری عوام، آزادی کی منزل پر پہنچیں گے"۔

جب ضیافت ختم ہوئی، تو میں آنجہانی مارشل چوتہہ کے پاس گیا۔ ان سے درخواست کی کہ وہ میرے ساتھ فوٹو اتروانے کا اعزاز بخشیں۔ مارشل چوتہہ نے کمال مہربانی سے رضامندی کا اظہار کیا۔ فوٹو کھینچنے کے بعد انہوں نے ہاتھ ملایا اور مجھ سے کہا "مجھے امید ہے آپ پھر بھی چین ضرور آئیں گے"۔ میں نے عرض کیا "میرے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی" ...... رات کے گیارہ بجے ہم اپنے مسکن پر واپس لوٹے اور دوسرے دن صبح پاکستان جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

وزیرِ اعظم بھٹو، آنجہانی چو این لائی کے بیوہ کے پاس تعزیت کے لئے گئے۔ چو این لائی، چینی پارٹی کی مدبر شخصیت تھے۔ وزیرِ اعظم بھٹو سے ان کی ذاتی دوستی بھی تھی۔ ایک بار، وزیرِ اعظم بھٹو نے کہا تھا: "مجھے دنیا کے موجودہ سیاستدانوں میں سے چو این لائی سب سے زیادہ پسند ہیں"۔

چینی انقلاب کا یہ عظیم سپوت، اب شہر خموشاں کا مکین تھا۔ چیئرمین بھٹو ان کے گھر گئے اور ان کی بیوہ سے کامریڈ چو این لائی کی موت پر اپنے گہرے اور درد میں ڈوبے جذبات کا اظہار کیا۔

سیاسی بات چیت

دورۂ چین کے دوران دونوں وزرائے اعظموں اور ان کی خصوصی ٹیموں کے درمیان بات چیت کے بہت سے دور ہوئے۔ مشترکہ اعلامیہ، پریس کی خبروں اور دونوں وزرائے اعظموں کی ضیافتی تقاریر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مذاکرات انتہائی کامیاب اور مفید انجام تک پہنچے۔

سیاسی مبصرین کا اندازہ تھا کہ ان مذاکرات میں درج ذیل اہم امور پر بات چیت ہوئی۔

١۔ ہند چین اور پاک ہند تعلقات کا نیا پس منظر۔

٢۔ دفاعی اور اقتصادی تعاون۔

٣۔ ثقافتی تعلقات کا فروغ

٤۔ بین الاقوامی تعلقات (مشرق وسطیٰ، بحر ہند اور دیگر مسائل پر بات چیت)

جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جوابی ضیافت میں وزیر اعظم بھٹو کی تقریر خاصی تند و تیز تھی۔ اس تقریر سے واضح طور پر یہ تاثر جھلکتا تھا کہ چین ماضی کی مانند پاکستان سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے اور غیر مشروط طور پر پاکستان کے نکتۂ نظر کا حامی ہے۔

ان ہی دنوں ہند و چین سفارتی تعلقات بحال ہوئے تھے۔ ابھی کونسلیٹ کی سطح پر باہمی سفارتی تبادلے ہوئے تھے۔ مغربی پریس کا تاثر تھا کہ ہند اور چین تعلقات کی بحالی کی وجہ سے پاک چین تعلقات میں پہلے کی مانند مضبوطی، باہمی اعتماد اور تعاون قائم نہ رہ سکے گا۔ چین کا رویہ نرم ہو جائے گا۔ چودہ سالہ سفارتی مقاطع کی تلخی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی اور یوں ہند اور چین باہمی قربت اور افہام تفہیم کی منزل پر پہنچیں گے۔ پاکستان اور چین کے تعلقات اس پس منظر میں ثانوی حیثیت اختیار کر جائیں گے۔ تاہم وزیر اعظم بھٹو کے اس کامیاب دورے نے مغربی پریس کی پیشین گوئیوں

پر پانی پھیر دیا۔ پاک چین تعلقات کو مزید تقویت ملی۔ جس کا کھلا اظہار، دونوں وزرائے اعظموں کی ضیافتی تقاریر تھیں۔

موجودہ دنیا کو تین سیاسی گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک جانب وہ ممالک جہاں سوشلسٹ انقلاب برپا ہو چکے ہیں۔ دوسری جانب وہ ملک جہاں انقلابی تحریکیں سمندر کی شوریدہ سر لہروں کی مانند اٹھتی، پھیلتی اور بڑھتی جا رہی ہیں۔ تیسری جانب ایسے ممالک جو انقلابی عمل کو روکنے کے لئے دامے درمے سخنے امداد کر رہے ہیں۔ کوریا اور چین کا شمار پہلے گروپ میں ہے۔ جنگ عظیم دوم کے دوران اور فوراً بعد، جنوب مشرقی ایشیا میں سامراجی طاقتوں کے توازن میں تبدیلی آئی، جاپان کو شکست ہوئی۔ اور امریکی سامراج نے اس خلا کو پر کرنا چاہا۔ تاہم یہ درمیانی وقفہ، خواہ کتنا ہی مختصر تھا اس خطے میں انقلاب کے لئے زرخیز ترین لمحہ تھا۔ چین اور کوریا میں انقلابی تحریک، قومی آزادی کی جدوجہد کی صورت میں پہلے سے کافی مضبوط تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں کوریا اور ۱۹۴۹ء میں چین، نہ صرف آزاد ہوئے بلکہ یہاں انقلاب بھی آگیا۔ ہند چینی کے دوسرے ممالک میں، امریکہ نے بروقت شبخون مار لیا۔ لہٰذا ویتنام، لاؤس اور کمبوڈیا کو طویل تر جدوجہد کرنا پڑی۔ جنوبی کوریا اور تائیوان ابھی تک امریکہ کے منہ میں موجود ہیں۔ چین اور کوریا کے انقلاب کو اس کے صحیح تاریخی پس منظر میں سمجھنے کے لئے، ہم مندرجہ ذیل دو اہم عوامل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

A۔ قومی آزادی کی جدوجہد۔

B۔ کسان آبادی کی اکثریت۔

جنوب مشرقی ایشیا کے سارے انقلابات اور بالخصوص چینی اور کوریائی انقلاب، تاریخ کا نیا تجربہ ہیں۔ یہ انقلاب، سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی جنگ، یا ان ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کے تضادات کے نتیجے میں برپا نہیں ہوئے۔ جب ان ممالک میں انقلابات برپا ہوئے تو اس وقت یہ ممالک، سامراجی غلامی اور قدیم جاگیردارانہ طرز حیات کے جنگل میں جکڑے ہوئے تھے۔ گویا یہ انقلابات، جاگیرداری نظام سے براہ راست سوشلسٹ نظام میں جست لگانے کے مترادف ہیں

چونکہ یہ انقلابات کلاسیکی طرز پر رونما نہیں ہوئے قومی آزادی کی جدوجہد اور کسان عوام کی شرکت نے ان انقلاب کو ملکی بنایا ہے۔ لہٰذا یہ پس منظر بہت سارے یورپی رفیقوں کی سمجھ میں نہیں آپاتا وہ دوست جو یورپ کی درس گاہوں میں سوشلزم کا مطالعہ کرتے ہیں یورپی دانشوروں کے حلقہ فکر میں اٹھتے بیٹھتے ہیں نہیں نہ تو ایشیا کے کسان پس منظر کی سمجھ آپاتی ہے اور نہ وہ جاگیردارانہ نظام کی گرفت سے پوری طرح نکل پاتے ہیں ہمارے ان یورپی دانشوروں یا "یورپ مارکہ" دانشوروں کے لئے ایشیا [illegible] تمام عمل ایک جمہوریت پرستی کی داستان ہے وہ قوم پرستی کو بھی کلاسیکی معانی میں تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں پٹڑی سے اتر جاتے ہیں وہ یہ بات سمجھ نہیں پاتے کہ ایشیا کے نیم آزاد نیم غلام، غریب اور پسماندہ ملک میں، قومی جدوجہد آزادی سے مراد ہے سامراج سے براہ راست تصادم لیکن یورپ کی بورژوا ریاستوں میں قوم پرستی، نازی ازم یا سامراج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا اس دوسری صورتحال میں قوم پرستی واقعی ایک بورژوا سوچ ہے۔

ایشیا کے ممالک میں انقلاب آ بھی جائے، تو بھی اپنی ماہیت کے اعتبار سے اُسے کُل انقلاب نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایشیائی انقلاب تاریخ کی ایک اہم کڑی (یعنی سرمایہ دارانہ نظام) کے وجود سے عاری ہوگا۔ لہٰذا یہاں قدیم جاگیردارانہ نظام سے "جست" لگانا پڑے گی تاکہ درمیانی کڑی کو سوشلسٹ نظم کے تحت عبور کیا جا سکے۔ چنانچہ سوشلسٹ معیشت کے تحت صنعت کو فروغ دینا ہوگا۔ ملک کی کسان ذہنیت کو پرولتاریہ ذہنیت میں بدلنا ہوگا۔ کسان کی زمین سے چپکی ہوئی سوچ کو پرولتاری سوچ میں، روایت پسندی کو حقیقت پسندی میں تبدیل کرنا، زرعی پس منظر کو صنعتی پیش منظر میں ڈھالنا، یہ انتہائی وقت طلب اور صبر آزما مراحل ہیں۔ لہٰذا پرانی روایات اور اخلاقی ضابطے آہستہ آہستہ اور ایک ایک کر کے نئے رشتوں میں بدلیں گے۔ ایک دن میں یہ تبدیلی نہ آ سکے گی کیونکہ بالائی ڈھانچہ آہستہ آہستہ تبدیل ہوتا ہے۔ یورپ میں یہ تبدیلی ۲۰۰ سو سے لے کر تین سو سال تک کے عرصے میں آئی تھی۔ یہاں کچھ تھوڑا بہت عرصہ تو لگے گا۔ افغانستان والے غازی امان اللہ کی طرح ایک ہی دن میں بالائی ڈھانچے تبدیل کرنے والے خود منظر سے غائب ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ ایشیا کا مزاج ہے۔ آتش فشاں کی مانند ہر

مغز سلگتا ہوا، اور پیچ و تاب کھاتا ہوا۔۔۔۔ پورے سماج کو ایک صورتحال سے (یعنی جاگیردارانہ طریقۂ نادرست) دوسری صورتحال (یعنی سوشلسٹ طریقۂ کار) میں آگے لے جانا، ایک زبردست تاریخی تجربہ ہے۔ جس کا انتہائی ہمدردانہ اور گہرائی سے مطالعہ کیا جانا لازمی ہے۔

کوریا، ابھی تک آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ لہٰذا کوریا کی کمیونسٹ پارٹی کسی اندرونی تضاد کا شکار نہیں۔ جدوجہد کا مرکز براہِ راست سامراج ہے۔ منطقی طور پر کسان آبادی اور پیٹی بورژوازی تک۔۔۔۔ قوم کے سوال پر کوریا ورکرز پارٹی کے پروگرام کی زبردست حامی ہے۔ جب تک کوریا کے سامنے آزادی یا غلامی کا سوال موجود ہے۔ ورکرز پارٹی میں اندرونی اختلافات ثانوی حیثیت میں رہیں گے۔ تاہم قومی سوال سے نمٹنے کے بعد، کوریا میں بھی ثقافتی انقلاب کا غلغلہ بلند ہوگا۔ خواہ کوریا والے اسے کوئی اور نام دیں یا نہ بھی دیں تاہم جب ان کی جدوجہد کا مرکز اور بنیادی نکتہ قومی سطح سے بدل کر طبقاتی سطح پر آجائے گا تو وہاں بھی پارٹی کو اپنی لائن درست رکھنے کے لئے اندرونی جھاڑ پھونک کی ضرورت محسوس ہوگی۔ فی الوقت حالات جیسے کے ہیں۔ ویسے ہی رہیں گے۔ لہٰذا کوریا اندرونی تضادات کو سمیٹتا ہوا ترقی کی منزلوں پر گامزن رہے گا۔

انقلاب کے بعد، اور قومی جدوجہد آزادی کے بعد، انقلابی جماعتوں کو جس "دشمن" کا سب سے زیادہ سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہے پارٹی کے اندر "دانشور نیم بورژوائی" سوچ۔ یہ سوچ اپنے اظہار کے لئے خوبصورت، انقلابی اصطلاحات کا استعمال کرتی ہے مگر اپنے عمل اور فکر کے لحاظ سے پرولتاریہ نہیں بن سکتی۔ انقلابی جماعتوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سوچ انقلاب کے دوسرے مرحلے پر سامنے آتی ہے یعنی جب ملک کے اندر سوشلسٹ نظام کے تحت صنعتیں قائم ہونا شروع ہوجاتی ہیں معیشت پرانے سے نئے نظام میں کروٹ لینے لگتی ہے اور عوام کا بنیادی تضاد،۔۔۔۔ طبقاتی کشمکش [illegible] جوں جوں [illegible] تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ پارٹی کے اندرونی تضادات بھی اسی رفتار سے سامنے آتے جاتے ہیں۔ اسی حساب سے پارٹی کے اندر موجود پیٹی بورژوازی "دائیں جانب" یا پھر "بائیں" جانب چھلانگیں مار کر پارٹی سے باہر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ روس میں یہ اندرونی کشمکش

لینن کے دور میں ہی واضح طور پر شروع ہو گئی تھی اور اسٹالین کے دور میں یہ اندرونی کشمکش انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

چینی کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں سے بات چیت کے بعد اور چین کی موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ثقافتی انقلاب، پارٹی کی اندرونی کشمکش کا پہلا بھرپور اظہار تھا۔ تاہم یہ کشمکش ابھی تک جاری ہے۔ اسے ذاتی اقتدار کی رسہ کشی قرار دینا، اول درجے کی حماقت ہوگی۔ اسے مختلف گروہوں کی باہمی چپقلش سمجھنا سیاسی دیوالیہ پن کا ثبوت ہوگا۔ چینی کمیونسٹ پارٹی ایک نئے تجربے سے دوچار ہوئی۔ نظریاتی کشمکش کے ایک نئے دور سے گزر رہی ہے۔ اس اندرونی جدوجہد میں کئی موڑ آئیں گے کیونکہ یہ تاریخ کا سب سے انوکھا تجربہ ہوگا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کیا کمیونسٹ پارٹی طبقاتی تضادات کو زندہ رکھ کر انقلاب کو عوام کی آخری پرت تک پہنچانے کی جدوجہد میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔ چیئرمین ماؤ نے مرض کی تشخیص بھی کر لی تھی اور علاج بھی تجویز کر دیا تھا یعنی عوام کو مسلسل ابھارا جائے۔ ان میں طبقاتی شعور پھیلایا جائے تاکہ پارٹی کے اندر "دائیں" اور "بائیں جانب" کی سرحدیں نمایاں ہو جائیں۔ ہمارے دورہ چین کے دوران، مزدوروں نے "آٹھ گریڈ سسٹم" کے حوالے سے طبقاتی جدوجہد تیز کرنے کے پوسٹر لگا رکھے تھے کیونکہ چیئرمین ماؤ نے . . . . طبقاتی جدوجہد کے متعلق، عوام کو کال دے رکھی تھی۔

اگر چینی کمیونسٹ پارٹی ثقافتی انقلاب کے تجربے کو دہرانے میں ناکام رہی۔ اگر پارٹی کے اندر پیٹی بورژوا کی سوچ حاوی ہو گئی یا پھر بائیں بازو کی مہم جوئی، غالب آ گئی تو چینی انقلاب کو زک پہنچے گی اور چینی کمیونسٹ پارٹی بھی روس والوں کی مانند "سفید کالر" انقلابیوں کی جماعت بن کر رہ جائیگی۔ تاہم اس خطرے کا امکان بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چیئرمین ماؤ کی قیادت میں عوام کو بے پناہ متحرک کیا گیا ہے اور پارٹی کے اندر پیٹی بورژوا ذہنیت کے خلاف انتہائی جدوجہد کی گئی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا۔ اپنی درست سوچ اور عوام کی رہنمائی میں انقلاب کے دوسرے مرحلے سے بھی کامیاب گزرے گی۔

بعض ساتھی جب انقلاب کی بات کرتے ہیں تو کیوبا کے انقلاب کو بطور موازنہ پیش کرتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کیوبا کا انقلاب ہماری تاریخ کا زبردست کارنامہ ہے۔ کیوبا نے نئی دنیا بسائی ہے۔ فیدل کاسترو عظیم انقلابی رہنما ہیں۔ چے گویرا کی جدوجہد، اس کے خلوص اور جذبہ حریت کی لافانی داستان ہے۔ تاہم جنوب مشرقی ایشیا اور لاطینی امریکہ کے مسائل میں فرق موجود ہے۔ چین اور کیوبا کے انقلاب کا باہمی موازنہ کرنا . . . ایک غلط ابتداء ہے لہٰذا اس موازنے سے غلط نتیجہ اخذ ہوگا۔ ہر انقلاب پر اس ملک کے اپنے حالات اور گرد و پیش کی چھاپ ضرور ملے گی۔ انقلاب کوئی حسابی فارمولہ نہیں، جس کا جواب ہمیشہ اور ہر جگہ ایک سا آئے۔ کیوبا ایک چھوٹا ملک ہے۔ جس کی آبادی ۲۵ لاکھ ہے۔ اس انقلابی ملک کے اپنے مسائل اور اپنے حوالے ہیں۔ چین کی آبادی ۹۰ کروڑ ہے۔ لہٰذا چین کے اپنے مسائل اور اپنے حوالے ہیں کیوبا سوشلسٹ ممالک کا "تاچیائی" بن سکتا ہے۔ ایک ماڈل کیوبا، لیکن چین جیسے، دنیا کے سب سے بڑے ملک کے لئے.. مسائل کے انبار بھی کیا اتنے ہی بڑے نہ ہوں گے لہٰذا چاہئے کہ ہم سوشلسٹ ممالک سے سیکھیں خواہ وہ چین ہو یا روس، کیوبا ہو یا کوریا کیونکہ یہ سارے ملک انقلاب کے عمل سے گزرے ہیں۔ انہوں نے نئے نظام تعمیر کئے ہیں۔ ہم نے ابھی پہلا مرحلہ بھی طے نہیں کیا۔ لہٰذا ہمیں ان ممالک کے تجربات سے صرف اور صرف سیکھنا ہے۔ نزکراوتی اور لاحاصل بحثوں میں الجھنا جس کی پاکستان میں ابھی کوئی معروضی ضرورت نہیں۔ ہوسکتا ہے یورپ کی درسگاہوں میں ذہنی تفریح کے لئے یہ کج بحثیاں ضروری اور لازم ہوں مگر ہمارے لئے یہ بحثیں، بے معنی لاحاصل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

دائیں بازو کے دانشور، اپنی تحریر و تقریر میں سوشلزم کے خلاف، متروک دلائل کے انبار لگاتے ہیں۔ میرا ذاتی طور پر خیال ہے کہ اگر انہیں چین یا کوریا جانے کا موقع ملے تو ان میں سے اکثریت اپنا نکتہ نظر درست کرنے پر مجبور ہو جائے گی سوشلزم پر ان کے اعتراضات میں کوئی حقیقت ہے نہ وزن۔

مشہور فرانسیسی مفکر ژاں پال سارتر سے کسی نے پوچھا، آپ کا اپنا فلسفہ تھا، آپ نے اسے چھوڑ کر مارکسزم کو کیوں اپنایا؟ پال سارتر نے جواب دیا "جناب ہمیں درس گاہوں میں ردِ مارکس پر

دلائل دیئے جاتے تھے۔ لیکن جب میں نے مارکس کا مطالعہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ مارکس ان اعتراضات کو ڈیڑھ صدی قبل رد کر چکا ہے۔" اگر ان حضرات کو چین کی یاترا کرانے کا اہتمام کیا جائے تو قوم پہ بھی احسان ہوگا اور ان عظیم دانشوروں پہ بھی۔ بے چارے اپنے نظریات کے تنگ کنویں سے باہر نکل کر . . . شاید کچھ سمجھ ہی پائیں کہ انقلاب ان کے سارے اعتراضات کی بجائے خود جواب ہے۔

ادب اور کلچر

ہمارے ملک میں اور بالخصوص مغرب کے سارے سامراجی ممالک میں دانشوروں کی ایک کھیپ ایسی بھی موجود ہے۔ جو رات دن یہ پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں "سوشلسٹ لوگ نہ صرف نسلی گداریوں کے دشمن ہیں بلکہ ادب، ثقافت، کلچر، آرٹ اور شاعری ایسے فنونِ لطیفہ کے بھی دشمن ہیں" بدقسمتی سے ہمارے وفد میں بھی اسی حلقۂ فکر کے ایک دو صحافی حضرات موجود تھے۔ ان کے اخباروں میں یہ زہر فشانیاں جلی حروف میں چھپا کرتی ہیں۔ میں نے ان اصحاب میں سے ایک کو دعوت بھی دی "آئیے یہاں کے فنونِ لطیفہ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کریں۔" ان کا جواب تھا۔ "آپ دیکھئے! جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے عقائد پکے ہیں۔ ہم پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔" غور کیجئے صاحب کہتے ہیں "چونکہ ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا" اس لئے ہم کچھ دیکھنا، سیکھنا یا سمجھنا نہیں چاہتے اور چونکہ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، اس لئے "ہمارے عقائد پکے ہیں" مان گئے صاحب، واقعی بہت پکے ہوں گے۔ کون انہیں کیسے سمجھائے کہ صاحب، علم کا کوئی عقیدہ، کوئی ملک، کوئی زبان اور کوئی مذہب نہیں ہوتا سمجھنے کی کوشش تو فرمائیے، سمجھ نہ آئے تو اور بات لیکن جہاں دلوں پر پہلے ہی سے قفل لگے ہوں "وہاں" نہ کرنا اور نہ سیکھنا" ہی پکا عقیدہ ہوا کرتے ہیں تاہم حسنِ اتفاق تھا کہ ہم چین و کوریا میں تھے۔ لہٰذا ادب و ثقافت کے مسئلے پر ہم نے بہت سے چینی اور کوریائی دوستوں سے بات چیت کی۔ ان کا ایک ہی جواب تھا "جناب۔ آپ یہاں موجود ہیں۔ خود اندازہ کیجئے ہم

یہ سمجھتے ہیں کہ ادب و ثقافت کا فطری اور حقیقی ارتقا صرف اور صرف سوشلسٹ ریاست میں ہی ممکن ہے۔" میں نے اپنے قیام کے دوران چین اور کوریا کا بہت سا ادبی لٹریچر پڑھ ڈالا۔ شاعری کے مروجہ بحور، اور مطالب و معانی کا احاطہ کرنے کے لئے بہت سے شاعروں کے کلام کا مطالعہ بھی کیا۔ افسانے ناولٹ اور مختصر کہانی کا ہر روپ بھی دیکھا۔ موسیقی، ڈانس اور کلچر کو سمجھنے کی سعی بھی کی۔ فلم، ڈرامے اوپیرا کا تنقیدی جائزہ بھی لیا۔ میں نے جو کچھ اس مشاہدہ حق سے اخذ کیا۔ اسے مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کلچر کو زندگی کا ایک متحرک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ لوک گیت، لوک ڈانس اور لوک کہانیوں کو اپنا ثقافتی ورثہ سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ ڈرامہ، فلم، شاعری وغیرہ کے سلسلے میں۔ بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ممالک فارم (Form) اور تھنکنگ کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔

۴۔ مواد اور جوہر کے لحاظ سے ہم سے یکسر مختلف ہیں۔

اب آئیے۔ مندرجہ بالا چاروں نکات کی وضاحت کرتے چلیں۔ پہلے ہم نکتہ نمبر ایک لیتے ہیں۔ سوشلسٹ ممالک میں کلچر کو کوئی طلسم، ماورا اور مجرد شے فرض نہیں کیا جاتا بلکہ کلچر کو انسانی زندگی کے ارتقا، باہمی تجربات اور زندہ مسائل و افکار کا متحرک اور جاندار مجموعہ فرض کیا جاتا ہے۔ کلچر کا ایک ارتقائی عمل ہے۔ روایات مرتی اور ان کی جگہ نئی روایات تخلیق ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کلچر انسان کے سماجی رشتوں کا مخصوص طریقہ اظہار ہے تو پھر انسانی سماج کے ساتھ ساتھ یہ بھی گھٹتا، بڑھتا، پھیلتا، سمٹتا اور سارے تجربات کو سمیٹتا ہوا رواں دواں رہتا ہے۔ قبائلی نظام کا کلچر، سرمایہ دارانہ نظام کے کلچر سے یکسر مختلف ہے۔ بعینہٖ سوشلسٹ سماج میں کلچر کی اجتماعی حرکت ہم سے ایک قدم آگے کی سمت میں ہوگی۔ اس میں ہم جیسی باتیں بھی پائی جائیں گی اور ہم سے علیحدہ بھی۔ یہ عین فطری، قدرتی اور ارتقائی عمل ہے۔ کلچر پر جبری ارتقا کا حکم نہیں چلایا جا سکتا۔ نہ جبری طور پر اسے پچھلے گیئر میں ڈالا جا سکتا ہے۔ کلچر کو اگر کلیت میں لیا جائے تو پھر یہ اکثریت کے رہن سہن، خوشی، غمی، زندگی اور

موت کے رواجوں، روایتوں اور طریقۂ ہائے کار کا مجموعہ بھی ہوتا ہے۔ یہ رواج بنتے، بگڑتے، مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر یہ عمل انسانی سماج میں تاریخی تبدیلی کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔

سوشلسٹ ممالک میں عوام کی یعنی اکثریت کی مرضی مقدم اور فائق سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اکثریت کے کلچر کو رد کرکے، اکثریت کا متحرک تعاون کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں میں آپ کو بالکل عام سی ایک مثال دیتا ہوں۔ موت، حیاتِ انسانی کا سب سے تلخ اور زندہ المیہ ہے۔ مردے کو وداع کرنے کے بھی ثقافتی رواج ہیں یہ زندہ ثقافتی روایات ہیں۔ چین میں اگر کوئی کمیونسٹ مرتا ہے تو بدھ روایت کے مطابق مردے کو دفن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عیسائی یا مسلمان علاقوں میں جب کوئی کمیونسٹ مر جائے تو عوام مردے کو اپنے رواج کے مطابق دفن کرتے ہیں۔ عوام کے تسلیم شدہ رواجوں اور روایتوں پر کون قدغن لگا سکتا ہے۔ سوشلسٹ ممالک، تو عوام کا بنیادی رشتہ اپنی زمین کی تاریخ سے جوڑتے ہیں لہٰذا کلچر کا ایک فطری ارتقاء ان ممالک میں جاری وساری ہے کلچر کی جن روایتوں کو رد کیا جاتا ہے۔ انہیں حکماً رد نہیں کیا جاتا بلکہ عوام کی اکثریت از خود رضا کارانہ مگر تجربی حوالے سے ان مخصوص روایتوں کو رد کر دیتی ہے اور ان کی جگہ نئی روایتیں تخلیق ہو جاتی ہیں یہاں میں پھر آپ کو مثال دوں گا جاگیردارانہ نظام میں یا سرمایہ دارانہ نظام میں، طوائف کا ناچ گانا (اس کی صورتیں دونوں نظاموں میں اگرچہ مختلف ہیں) اور جسم فروشی بھی ایک زندہ ثقافتی روایت ہوا کرتی ہے۔ اس رواج کو ان نظاموں میں اگر قانون اور ضابطے سے بھی ممنوع قرار دے دیں تو بھی اسے ختم نہیں کیا جا سکتا (جیسے کہ ہمارے ہاں نہیں ہو سکا ہے)، چین میں طوائف فروشی کو حکماً اور قانوناً بند نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم جب سماج نے ایک نئے حالات میں چھلانگ لگائی۔ ایک ایسے معاشی اور سماجی حالات میں جہاں طوائف کا وجود فالتو اور ناکارہ تھا تو صرف اور صرف اس لیے عوام متحرک ہوئے۔ ان کے تعاون سے یہ روایت خود بخود ختم ہو گئی۔

یہاں ایک باریک سا نکتہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کلچر اور ثقافت، سماج سے ہٹ کر نہ جنم لے سکتا ہے اور نہ زندہ رہ سکتا ہے ..... یہ سماج کی ظاہری شکل ہے۔ لہٰذا جب سماج کے

معاشی اور سماجی رشتے بدلتے ہیں، تو کلچر میں از خود تبدیلی آتی رہتی ہے یعنی سماج کلچر کے تابع زماں نہیں ہوتا، بلکہ بات اس کے بالکل برعکس ہے مگر بادی النظر میں اس کے الٹ نظر آتی ہے چنانچہ مغرب کے اور مغرب زدہ "مظلوم دانشور" اس "الٹ" ہی کو حقیقت غیر متبدل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سماج کلچر کے تابع ہوتا ہے یہ بات یقیناً ایسی ہی ہے، جیسے کوئی سماج کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر دے اور پھر کہے "دیکھئے! اب حرکت کہاں ہے" ظاہر ہے اگر آپ سماج کو الٹا لٹکا کر دیکھنے کے متمنی ہیں تو پھر آپ کے "عقائد" واقعی پکے ہیں، مگر ان پکے عقائد کے پیچھے کیا ہے ایک ایسے سماج کی حقیقتیں جہاں ہر رویہ اور ہر نظریہ مخصوص مفادات کے شکنجے میں کسا ہوتا ہے

اب آئیے نکتہ نمبر ۲ کی جانب

لوک گیت، لوک کہانیاں اور لوک ڈانس کیا ہیں؟ یہ ماضی کی روایتیں ہیں۔ داستانیں ہیں۔ ایسی داستانیں جو اجتماعی ورثہ ہیں۔ جو انسان کے معاشرتی سفر کی لاشعوری تاریخ ہیں۔۔۔ اور خاص کر عوام کی زیریں پرت کے رجحانات ہیں یعنی تاریخی لحاظ سے زمانہ ماضی کے رجحانات کا اظہار ہیں ان گیتوں اور کہانیوں کو کسی ایک فرد نے نہیں لکھا بلکہ کائنات و حیات پر، زندگی کے مسائل پر، لوگوں کے عام رویے اور خواہشات پر مبنی ہوتی ہیں۔ فصل پیدا کرتے وقت کے گیت، فصل کے کٹائی کے ڈانس بہادروں اور دلیروں کے قصے۔ جو مصیبت میں پھنسے لوگوں کی مدد کرتے ہیں جن، بھوت اور آدم خور دیو زادوں کے قصے، جن میں دراصل زمانہ قدیم کے بادشاہوں، درباریوں اور امراء کی بے پناہ قوت کو جن، بھوت اور آدم خور دیو زادوں سے تشبیہہ دی گئی ہے ہیرو، جو اس "آفت" اور "بلا" سے نجات دلانے کے لئے آئے گا۔ تو صاحب لوک ورثہ، درحقیقت عوام کی زیریں پرت کا ورثہ ہے زمانہ قدیم میں ان کے مسائل اور سوچوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ لوک کہانیاں یا محبت کے مسائل "اس دور کی سماجی اور طبقاتی بندشوں کا اظہار ہیں" تصوف اور رہبانیت کی شاعری، فرار کی داستان ہے ظالمانہ اور بے رحم طبقاتی جبر کی بناء پر سماج کو تیاگ کر، مسائل سے چھٹکارا پانے کی کوشش ہے تاہم شعوری شاعری ہے اور شعوری فرار ہے۔ چیلن اور کریا میں، لوک گیتوں کی تعبیر و تشریح کی گئی ہے۔

زریں پرت نے نئے نظام کے تحت شعور کی نئی منازل طے کی ہیں۔ غلامانہ سماج کے آدم خور ختم ہو چکے ہیں۔ اونچ نیچ ختم ہے لہٰذا محبت میں امیر کے فسانے ختم ہوئے۔ اب ان کی روایتی یاد باقی ہے۔ بالائی ڈھانچہ از خود تبدیلی کے عمل سے گذر رہا ہے۔ زندگی کا معیار بدل رہا ہے۔ لہٰذا چین اور کوریا کے عوام اپنے لوک ورثے کو تاریخی اور طبقاتی حوالے سے دیکھتے ہیں۔ اندھا دھند تقلید کی بجائے اُسے جانچنے پرکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب نکتہ نمبر ۳ کا جائزہ لیتے ہیں۔

ادب اور فنونِ لطیفہ پر جتنا زور چین اور کوریا میں دیا جاتا ہے، شاید دنیا کے سارے ترقی ممالک کے سارے تجربے اس کے سامنے ہیچ ہوں۔ موسیقی میں نت نئے تجربات کئے گئے ہیں۔ لوک دھنوں کو قومی سطح پر ابھارا گیا ہے۔ فلم، اوپیرا، شاعری اور نثر میں نئی تکنیک کا استعمال عام ہے۔ میں یہاں چینی اور کوریائی اوپیرا کی مثال دوں گا۔ اوپیرا دراصل سٹیج ڈرامے کی ایک شکل ہے جو اس سے زیادہ لطیف اور نفیس ہے۔ ڈائیلاگ کی بجائے شاعری، موسیقی اور بیلے ڈانس کے ذریعے کہانی چلتی ہے جو زیادہ مشکل صورت ہے۔ اوپیرا کی کہانی کو فی الوقت موضوعِ بحث نہیں بنائیں گے کیونکہ ابھی ہم صرف تکنیک پر بحث کر رہے ہیں۔ اوپیرا میں کہانی کا پس منظر تصاویر کے ذریعے ابھارا جاتا ہے۔ اگر آپ چینی یا کوریائی اوپیرا دیکھیں تو سٹیج پر روشنی کے تاثرات، صوتی اثرات، تصاویر کی پس منظر جو ہر سین کے ساتھ مکمل طور پر بدل جاتا ہے، اداکاروں کی حرکات، ڈانس اور موسیقی کا سنگم، نئی بھرپور یکجائیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ آپ کو سٹیج پر "زندہ فلم" کا نقشہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہمارے وفد میں بہت سے جہاں دیدہ حضرات موجود تھے۔ ایسے بھی جنہوں نے بی ٹی کا مشہور زمانہ اوپیرا بھی دیکھ رکھا تھا، یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی اوپیرا کی پرفارمنس کئی بار دیکھ چکے تھے۔ تاہم کوریائی اوپیرا دیکھ کر یہ حضرات بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ مدد یہ تھی کہ سٹیج کی ایک سائڈ پر ہر گیت کا ترجمہ انگریزی کے حروف میں سامنے آتا تھا۔ یہ اہتمام ہم غیر ملکیوں کے لئے تھا تاکہ ہم کہانی کے ہر موڑ سے آگاہ ہو سکیں۔ گویا فلم کی مانند اوپیرا کو "ڈب" کر کے دکھایا گیا۔ ڈرامے کی تکنیک بھی اوپیرا کی طرح بے پناہ "سادگی اور تاثر" کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ شاعری میں براہِ راست تاثر، جیسے

ہوسے ان نثری نظم کا رواج چلا ہے اگرچہ اپنایا جاتا ہے۔ بحروں میں بھی شعر کہے جاتے ہیں تاہم یہ بات ذہن نشین رہے کہ شاعری کو ان ممالک میں موسیقی کے مترادف سمجھا جاتا ہے لہٰذا موسیقیت درحقیقت شعر کی خوبصورتی کہلاتی ہے۔ شارٹ اسٹوری بھی مروج ہے اور ناولٹ بھی جو تکنیکی اعتبار سے کسی طرح مغرب سے پیچھے نہیں کہلائے جا سکتے۔ فلم کا آرٹ سوشلسٹ ممالک میں بہت موثر سمجھا جاتا ہے۔ فوٹو گرافی اور سیٹ ڈیزائننگ میں بے پناہ "واقعیت" کا تاثر ملے گا پس منظر اور اداکاری میں ازحد یکجائیت اور ربط ہوگا۔ تسلسل اور ایڈیٹنگ میں کہیں جھول نظر نہ آئے گا۔ الغرض آپ فلم دیکھ کر کسی طور فنی یا تکنیکی طور پر مایوس نہ ہوں گے۔

آئیے اب آتے ہیں نکتہ نمبر ۳ کی جانب۔

یہ نکتہ ہی درحقیقت سارے "فساد" کی جڑ ہے یعنی ادیب کون سے موضوعات پر لکھتے ہیں شاعری، ڈرامے، شارٹ اسٹوری، فلم کی کہانی کا بنیادی نکتہ، حقیقی جوہر یا موضوع کیا ہوتا ہے !

اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سوشلسٹ ممالک میں ادب کی جبری صورت پائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی گہرائی اور کوئی وسعت نہیں ہوتی۔ اس میں محض "مقصدیت" ہوتی ہے جسے عرفِ عام میں پروپیگنڈہ کہا جا سکتا ہے۔ مقصدیت اور بے مقصدیت، یا ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحثیں ہمارے ہاں بھی بہت ہو چکیں۔ ترقی پسند تحریک کے خلاف ہمارے ہاں بہت سی جنگیں لڑی گئی ہیں میں نہیں سمجھتا کہ مجھ جیسا غیر ادیب اس بحث میں کوئی قابلِ قدر اضافہ کر سکتا ہے تاہم بقول غالب ؎

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات

جہاں تک مقصدیت اور بے مقصدیت کا تعلق ہے۔ یہ تخصیص ہی ناممکن ہے۔ بے مقصدیت بجائے خود ایک مقصد ہے۔ کسی خاص رویے، رجحان یا خواہش کا مقصد، قرار بجائے خود صورت ہے مایوسانہ تلاش کی۔ چنانچہ دنیا کے کسی خطے، کسی دور یا کسی ادیب کی نگارشات "بے مقصد" قرار نہیں دی جا سکتیں یا محض برائے ادب کی کوشش سے تعبیر نہیں کی جا سکتیں۔ ہر کاوش، نگارش اور تخلیق کا کوئی خاص پس منظر ہوتا ہے (یعنی اس دور کے سماجی اور تاریخی حالات) ہر شعر کے کوئی معانی ہیں۔

ہر کہانی کا کوئی کلائمکس ہے۔ کوئی مجموعی تاثر ہے اور یہ تاثر کچھ نہ کچھ نتیجہ برآمد کرتا ہے۔ لاشعوری طور پر ہی سہی، کسی مقصد کی غمازی کرتا ہے۔ کسی خاص رویئے کے حق میں اور کسی خاص رویئے کے خلاف۔ یہ رویئے کسی سماج کے رویئے ہوں گے۔ کسی فرد کے رویئے ہوں گے اور منطقی طور پر کسی خاص طبقے کے رویئے ہوں گے۔ ان رجحانات کی حمایت یا مخالفت، ان رویوں کی تردید یا تائید، بجائے خود ایک مقصدیت ہے۔ اگر مقصدیت پروپیگنڈہ ہے تو پھر یقیناً بائبل سے لے کر "ابھی تو میں جوان ہوں" تک ہر تحریر پروپیگنڈہ کے زمرے میں آسکتی ہے۔ اگر دنیا کے کسی ادب میں کوئی ایسی تحریر نظر آجائے جس سے کوئی نتیجہ نہ برآمد ہو تو پھر اس کا حوالہ مجھ ایسے کم علم کو ضرور بھیجئے کیونکہ میں سیکھنے میں یقین رکھتا ہوں۔ میرے عقائد آپ کی مانند "پکے" نہیں۔

آج کے دور میں "بے مقصدیت" (ادب برائے ادب) کی اصل جائے پیدائش، یورپ کے وجودی مفکر ہیں۔ درمیانے طبقے کے ان دانشوروں کے ذہن، دونوں عظیم جنگوں کے بارود نے شل کر کے رکھ دیئے۔ ان کے لئے زندگی ایک بے معنی استعارہ بن گئی (یہ نکتہ نظر بھی اس خاص مخصوص سماجی اور تاریخی وجہ کے پس منظر سے ابھرا ہے اور اس کا بھی کوئی "مقصد" ہے یعنی بے معنویت اور فرار۔ سماج کی حقیقتوں سے فرار)

چلئے! آپ کو بے معنویت اور بے مقصدیت کے باوا آدم کے پاس لے چلتے ہیں۔ فرانس کے ژاں پال سارتر سے ملواتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "زندگی ایک لغو اور بے معنی سفر ہے" درست لیکن دوسری سانس میں کہتے ہیں۔ انسان اس بے معنویت کو ہر لمحہ معانی دینے پر مجبور ہے۔ چلئے "مجبور" سہی مگر تسلیم تو کر لیا کہ زندگی کو معنویت دینا یا مقصدیت دینا انسان کی "مجبوری" ہے۔ پس جب وہ اسے بے معنی قرار دیتا ہے۔ تب بھی وہ اسے ایک خاص "معانی" دے رہا ہوتا ہے اور جب با معنی قرار دیتا ہے تب بھی کوئی "مقصد" دے رہا ہوتا ہے گویا مفر ممکن نہیں۔ زندگی سے یا زندگی سے وابستہ معروضیات سے، یعنی زندہ مسائل سے فرار کی کوئی صورت نہیں کیونکہ فرار، اقرار یا انکار کی ہر صورت "با مقصد" ہے۔ جب انسان زندگی کو مقصد دیتا ہے تو زندگی کی کلیت کو معانی دیتا ہے۔ بمقصد دیتا

ہے یعنی پہلے سے موجود معانی کو بدلنے کی سعی کرتا ہے۔ ادب زندگی کے مسائل کے نثری یا شعری اظہار کا نام ہے۔ لہٰذا ادب اتنا بے ادب کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ محض برائے ادب ہی رہے۔ منطقی طور پر ہر ادیب معانی دیتا ہے۔ مقصد دیتا ہے اور یا بقول آپ کے "پروپیگنڈہ" کرتا ہے۔

اگر بات یہاں تک درست ہے تو پھر چلئے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں یہ مقصدیت، معنویت یا "پروپیگنڈہ" کسی ٹھوس حقیقت کے حق میں ہوگا یا اس کے خلاف۔ یہ ٹھوس حقیقت کسی حقیقی سماج میں موجود ہوگی۔ رویئے، نظریئے، رجحانات اور سارے حقائق، دراصل کسی سماج میں بسنے والوں کے ارد گرد گھومتے ہیں یعنی انسان کے باہمی رشتوں سے جنم لیتے ہیں۔ ان رشتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان رشتوں کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ انسان کے باہمی رشتوں میں سماجی تضاد ہے۔ زبردست تفاوت ہے۔ یہ رشتے آزادی سے طے نہیں پاتے یہ رشتے ناہموار ہیں راستے کٹھن ہیں۔ جنگیں ہوتی ہیں جو پال سارتر کو زندگی کی حقیقت سے برگشتہ کر دیتی ہیں۔ ادیب کو زندگی کی بجائے الفاظ کی غاروں میں پناہ لینے پر آمادہ کر دیتی ہیں۔ وہ الفاظ کے چونے گارے سے خواہشات کی دنیا تعمیر کرتا ہے پھر اس میں پناہ لیتا ہے۔ یہ ادب برائے ادب کے معانی ہیں۔ یہ اس کی تہہ میں پوشیدہ معانی ہیں۔

سماج میں اونچ نیچ کے رشتے ہیں۔ ناانصافی کی روایات ہیں۔ خود غرضی کے رجحانات ہیں۔ ظلم کے ضابطے ہیں۔ جبر کی بندشیں ہیں۔ اسی ماحول سے کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ یہ متصادم رویئے ہی دراصل ایک طبقاتی سماج کی علامت اور شہادت ہیں۔ ہم طبقاتی سماج میں بستے ہیں کسی نہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے طبقے کے تعصبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یا اس میں شعوری تبدیلی لاتے ہیں۔ کسی طبقے کے خلاف لکھتے ہیں کسی طبقے کے حق میں لکھتے ہیں۔ طبقات کے باہمی جدل سے متاثر ہوتے ہیں۔ سارے ادب نے باہم معاشرتی نزاع سے جنم لیا ہے۔ جو اس نزاع کا شعور رکھتے ہیں۔ انہیں ادب برائے زندگی کہہ لیجئے۔ جو اس شعور سے بے بہرہ ہیں۔ انہیں ادب برائے ادب کہہ لیجئے۔ آج تک جتنا ادب تخلیق ہوا ہے۔ وہ اس پیمانے پر ماپا جا سکتا ہے۔ طبقات کی کسوٹی پر پرکھ لیجئے کہ سارا لٹریچر شعوری یا لاشعوری طور پر طبقات کے باہمی نزاع کی نمائندگی کرتا ہے۔ لہٰذا چین اور کوریا والوں پہ کیا دوش؟ وہ

شعوری سطح پر ادب تخلیق کرتے ہیں۔ عوام کی زیریں پرت کے رجحانات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔

ادب برائے ادب کیا ہے ؟ اس نکتہ نظر سے متفق دانشور و ادیب کو ایک مکمل اکائی فرض کرتے ہیں یعنی سماج کے زندہ رشتوں سے علیحدہ ، تنہا اور ماوراء ۔ زندگی کے پیچ و خم سے بے غرض ، مسائل و انکار سے پاک ۔ تعصبات سے بالاتر ۔ یک مکمل اکائی جو تکمیل بالذات کے اصولوں پر وجود میں آتی ہے یعنی ادب ، ادب ہی سے پیدا ہوتا ہے ادب ہی کے لئے پیدا ہوتا ہے ۔ ادب ہی کی تکمیل کرتا ہے ۔ اس کا زندگی یا سماج سے کوئی رشتہ ، رابطہ یا تعلق نہیں ۔ اسی طرح ادیب ، سماج سے ، ذمہ داری لزوم سے آزاد ، ایک مکمل ، مافوق الفطرت وجود ہے ۔ جو اپنے گرد و پیش سے نہ متاثر ہوتا ہے اور نہ اسے متاثر کرتا ہے ۔ گویا ادب برائے ادب کا نظریہ ۔ مافوق الفطرت ادب اور مافوق الفطرت ادیب کا نظریہ ہے ، جسے کسی صورت میں منطقی اور سماجی استدلال کے حوالے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا ، درست قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ ناممکن نظریہ ہے ۔ نہ تو ادیب سماج سے باہر زندہ رہ سکتا ہے ۔ اور نہ سماج کے نزاع کے بغیر اور حیات و کائنات کی موجودیت سے پرے ، کوئی کہانی ، شاعری یا ادب جنم لے سکتا ہے ۔ اگر سماج سے ماوراء ، کوئی مابعد الطبیعیاتی لٹریچر تخلیق ہوتا بھی ہے تو وہ بھی کسی خاص طبقے فرد یا سماج کے مایوسانہ فرار کے مترادف ہے لہٰذا اسے بھی ادب برائے ادب کی تعبیر و تشریح یا حوالے کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا ۔

جس طرح ادب برائے ادب کا نظریہ ہے ، اسی طرح اس مایوس طبقے کے اور بھی بہت سے غیر حقیقی نظریات ہیں ۔ یعنی یہ نظریات حقیقت کو غیر حقیقت ، تغیر کو ثبات اور زندگی کو موت میں بدلنے کی موہوم کوششوں کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ لہٰذا حسن برائے حسن ، محبت برائے محبت ، ..... وغیرہ ، وغیرہ ایسے نظریات بھی اسی طبقے کی پیداوار ہیں ۔ محبت کیا ہے ؟ یہ اعمال محبت کے سوا کوئی شے نہیں ، دو انسانوں کے زندہ ، ہمہ گیر اور متحرک رشتوں کی داستان ہے لیکن دانشوروں کا یہ گروہ محبت کو مقصود بالذات اور قائم بالذات فرض کرتا ہے (بالکل ادب کے نظریے کی مانند) حسن کیا ہے ؟ کیا حسن حسین اشیاء کے بغیر بھی کوئی چیز ہے ! محبت ، محبت کرنے والوں سے بغیر بھی اور علیحدہ بھی کوئی وجود رکھ

سکتی ہے؟ کیا انسان سماج کے بغیر بھی کوئی ادب تخلیق کر سکتا ہے؟ کیا ادب زندگی کی کلیت سے علیحدہ بھی وجود رکھ سکتا ہے یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر ادب مقصود بالذات کا نظریہ بھی ممکن نہیں۔ ادب برائے ادب کی اصطلاح ہی ناممکن ہے بلکہ اس اصطلاح کے خالق، اپنے مخصوص سماجی رویوں کا اظہار اس اصطلاح کے پردے میں کرتے ہیں وہ کسی خاص طبقے کے نظریات کا پرچار کرتے ہیں مگر اقرار کی جرأت نہیں رکھتے۔ انکار اور مسلسل انکار کے پردوں میں، وہ مخصوص رویئے، رجحان اور نظریئے پیش کرتے ہیں۔ اگر آپ ادب سے برائے ادب کا چھلکا اتار دیں تو پھر حقیقت واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔ "پروپیگنڈہ" یعنی جبری پروپیگنڈے کی مثال سنئے۔ دور کیوں جائیں۔ ایوب خان کے دور کی مثال لیجئے۔ "عشرہ ترقی" کا کتنا پروپیگنڈہ تھا۔ نظمیں، کہانیاں، قصے، اشعار اور جانے کیا کیا نہ لکھا گیا۔ ریڈیو اور ٹی وی نے کیا کیا نہ کہا! اخبارات نے کیا کیا نقشے نہ باندھے، مگر چونکہ سب کچھ سماج کے ٹھوس حقائق سے دور تھا۔ چونکہ اس ادبی یلغار کی تہہ میں حکمران طبقے کے مفادات پوشیدہ تھے۔ یہ عوام کے زندہ مسائل کو الجھاؤ میں دھکیلنے کی کوشش تھی۔ مگر حقیقت کے زندہ حوالوں سے عاری تھا کسی نے نہ مانا۔ گویا صرف اور صرف ایسا ادب مسلّم ہوتا ہے جس میں زندہ حوالے ہوں۔ جسے لوگ تجربی طور پر دیکھ سکیں چھو سکیں۔ جس کا ادراک کر سکیں جسے سمجھ سکیں اور محسوس کر سکیں یا جس کا تخیل میں احاطہ کر سکیں۔ اگر سوشلسٹ ممالک میں لٹریچر محض "جبری مشقت" کی تخلیق ہو تو اسے قبولِ عام نہ ہوگا مطلب یہ ہے کہ کوئی حقائق ہوں گے جبھی لوگ سنتے ہیں، پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ بات اصل موضوع سے پھسل کر بہت دور جا پڑی ہے لہٰذا آئیے اصل موضوع کی جانب پلٹتے ہیں یعنی چینی اور کوریائی فنونِ لطیفہ کے موضوعات کیا ہیں موضوع کے مسئلے کو ہم دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ قبل از انقلاب یا دورانِ انقلاب میں تخلیق پانے والے فنونِ لطیفہ

۲۔ بعد از انقلاب یعنی موجودہ دور میں تخلیق پانے والے فنونِ لطیفہ۔

جہاں تک پہلے دور کا تعلق ہے۔ اس دور کی شاعری، ادب، موسیقی وغیرہ پر طبقاتی ابھار کی واضح چھاپ ملتی ہے۔ اس دور کا لٹریچر، دنیا بھر کی ترقی پسند تحریک کے لٹریچر سے مشابہ ہے۔ کہیں کھل کر اور

کہیں افسانے وکہانیے سے اپنے دور کے تقاضوں، کشمکش اور جد و جہد کی عکاسی کرتا ہے۔ اسے پڑھنا، سمجھنا/ سمجھانا ہمارے لئے آسان ہے کیونکہ اس کی تخلیق، ایک ایسے سماج میں ہوئی جو ہمارے آج کے ماحول سے ملتا جلتا ہے ۔

ہمارا اصل موضوع دوسرے دور کا ادب ہے یعنی آج کا ادب جبکہ انقلابی طوفان کو آئے ۲۵ یا ۳۰ سال کا زمانہ ہو چکا ہے۔ چین اور کوریا کا موجودہ ادب، ہمارے نقادوں کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہونا چاہئے کیونکہ یہ ایک نئے سماج کے نئے تقاضوں کی عکاسی کرتا ہے۔ چین اور کوریا میں نئے رشتے، نئے رجحان، نئی صورتیں اور نئی روایات تخلیق ہوئی ہیں۔ سماجی، طبقاتی اور تاریخی حوالے پہلے سے یکسر مختلف ہیں۔ سماج بدلا ہے لہٰذا پوری سماجی نفسیات میں ایک ماہیتی تبدیلی آئی ہے۔ سماج کے رشتے بدلے ہیں، لہٰذا مسائل و افکار بدلے ہیں۔ ظاہری اور باطنی صورتیں، نئی صورتوں میں ظاہر ہوئی ہیں۔ ان کے ہاں ہیرو زندگی کے تصورات بدل چکے ہیں۔ ولین کا کردار بدل چکا ہے۔ کہانیوں کے آغاز اور انجام بدل چکے ہیں۔ انفرادیت پسندی کی جگہ اجتماعی سوچ نے لے لی ہے۔ لہٰذا سماج کو پرکھنے کا بنیادی معیار ہی بدل گیا ہے۔ ان کے ملکوں میں بسنے والے کسی فرد کو وہ مسائل درپیش نہیں ہیں جو ہمارے سماج میں موجود ہیں۔ لہٰذا ان کی کہانیوں اور شاعری میں کم از کم آدھی باتیں اور آدھے مسائل ضرور ایسے ہیں کہ ہمارے پلے پڑنے سے گریز کرتے ہیں۔ جس طرح کسی قبائلی نظام کا رہنے والا نیویارک کے مسائل یا وہاں کے ادب اور لٹریچر کو کیا سمجھ پائے گا۔ جس غریب نے بجلی صرف آسمان پر چمکتی دیکھی ہے اگر وہ نیویارک میں بجلی فیل ہونے کے بحران سے جنم لینے والی کوئی کہانی پڑھے تو وہ اپنی محدود تجربی استعداد کے باعث اس کہانی کے تار و پود کا احاطہ نہ کر سکے گا کتاب اٹھا کر پرے پھینک دے گا ۔

اور اسے ادب کی بجائے دیوانے کا خواب سمجھے گا۔ سوشلسٹ نظام میں . . . . اور ہمارے نظام میں اتنا ہی فاصلہ اور اتنا ہی فرق پایا جاتا ہے . . . . . تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان نئی حقیقتوں کو "دیوانے کا خواب" قرار دے کر، فخر سے یہ اعلان کرتے پھریں "ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا"۔ اگر کسی لٹریچر کو سمجھنا ہو تو اس خاص دور کو۔ اس خاص سماجی پس منظر کو سامنے رکھے بغیر ہمیں ہر بات دیوانے

کا خواب نظر آئے گی۔ لہٰذا چین اور کوریا کا موجودہ لٹریچر، ادب یا موسیقی حیاتِ انسان کے نئے تجربوں کی داستان ہے اور اسے اِک موجودہ تناظر میں رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں نے کلچر اور فنونِ لطیفہ کو چار خانوں میں منقسم کیا ہے اور پھر باری باری ہر خانے کی تعریف یا اُسے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ (یعنی جب ہم چیزوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو انہیں مختلف خانوں میں ڈال کر دیکھتے ہیں۔ اِن کے درمیان ایک مصنوعی حد بندی کر دیتے ہیں اور اس طرح دراصل ہم ان مخصوص چیزوں کو ان کے زندہ پس منظر سے "جبراً" علیحدہ کرنے اور پھر انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ کیا وہ چیزیں بھی ایک دوسرے سے لاتعلق ہیں۔ کیا وہ حقیقی طور پر بھی مختلف خانوں میں منقسم ہیں نہیں! چیزیں اس طرح منقسم اور ایک دوسری سے آزاد اور علیحدہ نہیں ہیں وہ کلیت کے مختلف پرتو ہیں۔ روشنی کے سات رنگوں کی مانند یکجا اور ناقابلِ جدا۔ زندگی ایک پوری اجتماعی کلیت ہے۔ کلچر اور فنونِ لطیفہ اسی اجتماعی کلیت کا اظہار ہیں۔ وہ زندگی کی منقسم اور جدا جدا شاخیں، نہیں ہیں بلکہ سماجی زندگی اور اس کے ارتقاء کے مختلف پہلو ہیں، جنہیں کلیت سے علیحدہ کر کے زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ انہیں سماجی حیات اور تاریخی ارتقاء کے مخصوص پس منظر میں رکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے (انہیں تقسیم تو محض سمجھانے کے لئے کرتے ہیں) مصیبت ہمارے ہاں یہ ہے کہ ہم چیزوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھنے کے عادی ہیں مگر ان سب کو جوڑ، اجتماعی کلیت بنا کر دیکھنے سے معذور ہیں (یہ ہماری انفرادیت پسند سماجی تربیت کی بنا پر ہم میں پیدا ہوتی ہے) لہٰذا ہماری (چیزوں کو خانوں میں منقسم کرنے والی سوچ) علمی کمزوری ہے۔ جس کی بنا پر نہ تو ہم اپنے سماج کا اور نہ دوسروں کے طور طریقوں کا حقیقی، کلی یا مجموعی جائزہ لے پاتے ہیں اپنے اپنے "علم کے خانے" ہاتھوں میں لئے "اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے راگ والی مثال کے مصداق، ڈھنڈورہ پیٹنے ہی کو تحقیق کا نام دیتے ہیں۔

مجھے رجعت پسند اور "انفرادی ٹائیفائیڈ" کے مریض دانشوروں کا علمی رویہ دیکھ کر اکثر وہ سات اندھے نظر آتے ہیں، جو ہاتھی دیکھنے گئے تھے۔ جس کے ہاتھ میں سونڈ لگی وہ فوراً پکار اٹھا "ہاتھی

بنگلے کی مانند ہے۔" جس کے ہاتھ ٹانگ پر پڑے، اس نے کہا "نہیں غلط کہتے ہو۔ ہاتھی ستون کی مانند ہے" تیسرے نے کان چھوتے ہی کہا "نہیں! بھائی لوگو، غلط کہتے ہو، ہاتھی تو بہت بڑے پنکھے کی مانند ہے" علیٰ ہذا القیاس۔ اتفاق یہ ہے کہ وہ سب صحیح بات کہہ رہے ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ ان کی بات سراسر غلط بھی ہے چونکہ انہوں نے ایک "کلیت" کو خانوں میں تقسیم کر دیا لہٰذا کلیت کا ادراک نہ کر پائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے وفد میں بھی بہت سے "اندھے" موجود تھے جنہوں نے چین اور کوریا کو، ان سات اندھوں کی مانند ہی دیکھا ہوگا اور سمجھا ہوگا۔

حقیقی علم، ان خانوں کو جوڑ کر پوری کلیت کے ادراک کرنے کا نام ہے اور نہ صرف ادراک کرنے کا، بلکہ اس کے لزوم سے آگاہ ہونے کا نام ہے تاکہ اسے انسانی سماج کی بہتری کیلئے تبدیل کیا جا سکے اور ڈھالا جا سکے۔ چین اور کوریا میں اجتماعی معاشرہ تخلیق کیا جا رہا ہے۔ معاشرتی لزوم کو انسانی مفاد کے لئے کارآمد بنایا جا رہا ہے لہٰذا وہاں کی علمی، فکری اور ادبی استعداد، سرمایہ دارانہ نظامِ حیات سے پورا ایک موڑ آگے ہے۔ یہ فطری بات ہے اور اٹل تاریخی حقیقت بھی ہے۔ ان کے فنونِ لطیفہ اور کلچر کو اگر ہم اپنے معیاروں پر پرکھیں گے یا اپنے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں گے تو شاید ہمارے پلے کچھ نہ پڑے، شاید ہم "ان اندھوں" کی طرح اس سے انصاف نہ کر سکیں، نہ خود سمجھ سکیں، نہ سمجھا سکیں۔

تاہم ایک بات اہم جو میں نے چین اور کوریا میں محسوس کی۔ وہ یہ کہ سماجی روایات کا ڈھانچہ معاشی نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مکینکل انداز میں تبدیل نہیں ہوتا بلکہ سماجی روایات، ایک سست رو عمل سے چلتی ہیں، اس لئے فی الفور ختم نہیں ہو پاتیں اور نہ فوراً ہی جنم لے لیتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ چین میں ثقافتی انقلاب کے دوران "کنفوشش ازم" کے قدیم نظریات کے خلاف شعوری سطح پر جدوجہد کرنا پڑی۔ کنفوشش کوئی ۲ ہزار سال پرانا چینی فلسفی تھا مگر اس کے نظریات چین میں اتنے عرصے بعد بھی روایات اور رسوم کی صورت میں موجود تھے۔ اگر معاشی تبدیلی کے ساتھ ثقافت کا مکینکل رشتہ ہوتا تو پھر ان نظریات یا روایات کو از خود ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ تاہم روایات کی تبدیلی اگرچہ مقابلتاً

سست رفتاری سے ہوتی ہے (بمقابلہ معاشی تبدیلی)، مگر اس تبدیلی کی سمت، معاشی تبدیلی ہی متعین کرتی ہے۔ گویا، روایات آہستہ روی سے انقلابی تقاضوں کی تقلید کرتی ہیں۔

تاہم، اس سست رفتاری کے باوجود، کلچر ثقافت، روایات، ادب اور موسیقی میں بے پناہ تبدیلی آچکی ہے کہ ہمارے لئے بہت سی باتیں اب نئی روایتیں اور نئی حکایتیں بن چکی ہیں جنہیں سمجھنا ہمارے بہت سے ساتھیوں کے لئے مشکل ہوا ہوگا۔

چین سے واپسی کا سفر طے ہو چکا تھا آخری رات ہم پیکنگ میں جی بھر کر پھرے۔ دوسرے دن ۳۰ مئی کی صبح کوئی بارہ بجے کے قریب ایئرپورٹ پر پہنچے چینی دوستوں کے ساتھ مل کر کھانا بھی ایئرپورٹ کے ریستوران سے کھایا۔ تقریباً ۱½ بجے تک ریستوران میں ہی چینی دوستوں سے گپ شپ لڑائی۔ وزیراعظم بھٹو اور وزیراعظم ہواکوفنگ گفت و شنید میں مصروف تھے لہٰذا انہیں دو بجے ایئرپورٹ پر پہنچنا تھا پونے دو بجے کا وقت ہوگا کہ ریستوران سے نکلے۔ ایئرپورٹ بچوں جوانوں اور بزرگوں سے بھر چکا تھا۔ ایک جانب پیکنگ کے پاکستانی سکول کے بچے کھڑے تھے، ملیشیا کی وردی پہنے ہوئے۔ دوسری جانب چینی بچے کھڑے تھے بعض کے بازوؤں پر سرخ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ سرخ پٹیاں ان بچوں کو ملتی ہیں جو اپنے اسکول کے کام میں بھی اچھے ہوں اور عوام کی خدمت میں بھی سب سے آگے ہوں۔ ان بچوں کو "ریڈ گارڈ" یا "سرخ محافظ" کہتے ہیں۔ چین کی سوسائٹی میں ان ننھے منے "سرخ محافظوں" کی بڑی قدر اور عزت کی جاتی ہے۔ سرخ محافظ صرف سکول کی سطح تک ہی بنائے جاتے ہیں۔ غالباً اس اعزاز کے ذریعے دوسرے بچوں کو ایک صحت مند مقابلے پر ابھارنا مقصود ہے۔

کوئی دو بجے کے قریب وزیراعظم بھٹو پہنچے، مصافحے اور معانقے ہوئے، نعرہ ہائے شوق کی برسات میں، ہم نے عظیم چین کو لال سلام پیش کیا اور واپسی کے لئے اڑے۔ جہاز میں بیٹھے تو تازہ "جنگ" پڑھنے کو ملا۔ تین چار قتل کی وارداتیں، اغوا اور چوری کی خبریں، مہنگائی اور رشوت کا رونا دھونا، وزراء کے بیان، اسلام کی عظمت کے قصے، علماء کے بھاشن ..... الغرض اخبار دیکھ

کر دلی اطمینان بھی ہوا کہ ہم پاکستان کو جیسا چھوڑ گئے تھے، چین اسی حالت میں موجود تھا . . . . .

جہاز کے اندر، چین اور کوریا سب ساتھیوں کی بحث کا موضوع تھے۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب بہت "کٹر رجعتی" تھے۔ ہم نے پوچھا "سنائیے صاحب!" بے چارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "عمر بھر جھک ماری ہے۔ اگر یہ سوشلزم ہے تو سو بار قبول" پارٹی کے ممبران اور وزراء نے بھی نئی دنیا کے اثرات کو دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا۔ تیمور شاہ جوگیزئی جیسا سخت گیر دست جان۔ اکبر پٹھان بھی بھٹو صاحب سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "صاحب! کچھ ادھر والا ہی بندوبست کریں۔ یہی نظام لائیں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عبدالوحید کٹپر بڑا جوشیلا انسان ہے۔ اب تو اس کے پاؤں جہاز پر نہ ٹکتے تھے۔ انقلاب، انقلاب کی آوازیں اس کی سیٹ سے مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر خالق درمیانے طبقے کے ذہین اور خاموش فرد ہیں لیکن میں نے خاموشی کے اس سمندر میں بھی انقلابی جوار بھاٹا کی لہریں اٹھتی محسوس کی ہیں۔ شیخ رشید تو سوشلزم کے ساتھ نبھانے والوں میں سے ہیں۔ ممبران کے چہرے پر روشنی دیکھی جا سکتی تھی۔ پیرزادہ بھی بہت متاثر نظر آئے۔ ناصر رضوی اور ملک مظفر خان وغیرہ واپسی کے سفر پر سوئے پڑے تھے۔ لہٰذا ان سے گپ نہ لگ سکی اور نہ ان کے تاثرات تک دسترس ہو پائی۔ اللہ جانے ان کا کیا خیال ہوگا؟ رہے بھٹو صاحب تو چین ان کے لئے نیا نہ تھا بلکہ وہ پہلے فرد تھے جو دس پندرہ برس قبل ہمالہ عبور کر کے چین پہنچے تھے۔ نہ صرف کوہ ہمالہ بلکہ سامراج کا ہمالہ بھی پھلانگ کر چین تک پہنچے تھے۔ چین ان کے لئے ہمیشہ باعث توجہ رہا ہے۔

مختصراً چین و کوریا نے سبھی کو متاثر کیا۔ تاہم ہمارے وفد میں دو چار افسران کرام ایسے بھی تھے، جن کے نزدیک یہ سب کچھ احمقانہ تھا۔ چین اور کوریا میں بھی یہ حضرات، ان لوگوں کو اپنی ذہانت سے متاثر کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اس گروہ کے عبداللہ بن ابی، مسعود محمود المعروف بہ ایف ایس ایف والے تھے۔ چین میں ایک دفعہ فرمانے لگے "مارشل چو تہ کیا ہے؟ اگر میں اتنی بڑی فوج کا جرنیل ہوں تو میں چو تہ سے بڑا جرنیل ہوتا" عرض کیا، "حضرت! خاموش رہئے ایسے کلمے ادا کریں گے تو ہم میں سے کسی کا بھی پارہ چڑھ سکتا ہے۔ سو پھر جرنیلی کو روتے پھریں

گئے" تاہم ان کی حرکات دیکھ کر مجھے شیخ سعدی بہت یاد آئے کیا خوب فرما گئے ہیں ۔

خرِ عیسےٰ گر بمکہ می برند ، .... خر باشد

یعنی حضرت عیسیٰ کی عظمت اپنی جگہ ، مکے کا تقدس اپنی جگہ ، لیکن عیسےٰ کے ساتھ مکے جانے والے سارے لوگ عیسیٰ نہیں بن سکتے ۔ ان میں سے کچھ تو گدھے کے گدھے ہی رہتے ہیں اور کچھ اسے صلیب پر پہنچا دیتے ہیں !

لیجئے : جہاز اب ہمالہ کی بلند ترین چوٹیوں کو چھوتا ہوا گذر رہا ہے ۔ سردی کی ایک شدید لہر جہاز کے اندر بھی محسوس کی جا سکتی ہے ۔ سبھی لوگ ہمالہ کی برف پوش چٹانوں کو دیکھ رہے تھے ، "مردِ قلندر" ایک بار پھر میرے قریب ہیں ۔

ان کی بلا جانے کہ نیچے ہمالہ ہے یا سمندر ۔ تاہم جب لوگوں کو ادھر ادھر جھانکتے دیکھا تو مجھ سے پوچھنے لگے "ایں .... کیوں بے .... لینڈ کر رہا ہے کیا" میں نے جواب دینے کی بجائے ان کے دونوں بازوؤں کے نیچے ہاتھ دیئے اور کھینچ کر کھڑکی کے قریب لا کیا اور کہا ، "اگر یہاں لینڈ کر گیا تو چند پشتیں بھی جناب کے جسدِ خاکی کو تلاش نہ کر پائیں گی" ۔ حضرت نے ہمالہ کی گلپوش وادیاں دیکھیں ، جہاز اور ہمالہ کے درمیان معمولی سا فاصلہ تھا ۔ جھرجھری لی اور اچھل کر اپنے مقام پہ واپس جا پہنچے

زاہد حسن میں یہ خرابی نہیں کہ وہ پیتے ہیں ۔ خرابی یہ ہے کہ زیادہ پیتے ہیں مگر جہاں تک ان کے کام کا تعلق ہے ۔ صرف وہ ہی ایک ایسے فرد ہیں ، جو بھٹو صاحب کی "شدتِ کار" کا سارا بوجھ سنبھالتے ہیں ۔ صبح آٹھ بجے حاضر ہوتے ہیں اور رات دو بجے تک ، ٹنگے رہتے ہیں ۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ کام کی شدت کا کیا عالم ہوگا ۔ سینکڑوں فائلیں ، ہزاروں خطوط ، ان کے جواب "ٹائپ کروانا اور بروقت انہیں اندر بھجوانا ، انہیں متعلقہ افراد تک پہنچانا ، بیچارے زاہد میاں ، ہمہ وقت جتے رہتے ہیں ۔ بھٹو صاحب نہ خود آرام کرتے ہیں اور نہ آرام طلب لوگ ان کے ساتھ چل سکتے ہیں ۔ زاہد میاں نہ پئیں تو کیسے جئیں ، کہاں جائیں اور کیا کریں ۔ سو ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ نے اگر کسی کو شراب

پارصلانی دی تو وہ زاہد میاں ہی کر لے گی۔ اس امید پر حضرت بھی جی بھر کر پی لیتے ہیں۔ اپنے ساتھ ان کی بیاری کی وجہ اور ہے۔ اس "بھری دنیا" میں شاید ہم دونوں ۲ - کا پیتے ہیں۔ لہٰذا جی بھر کر ایک شکے سے اُدھار لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ زاہد میاں جب اس کتاب کو پڑھیں گے تو سودا کی مانند یہ کہہ کر معاف کر دیں گے "ارے۔۔ یہ بھی "وہی" "نکلا" اور "وہی نکلا" سے حضرت کی مراد ہوتی ہے "وہ شیعہ نکلا یا احمدی نکلا"۔ حضرت، سامراج یا طبقات، کلچر، قومیت، امیر اور غریب، غرض کسی بات پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ تاریخ انسانی در حقیقت ۔۔۔۔ شیعہ سنی کشمکش کے حوالے سے چلتی ہے۔ باقی سب باتیں گھڑنتی ہیں اور فسانے ہیں :

یقین کیجئے روئے زمین پر اتنا حسن اور کہیں نہیں، جتنا ہمالہ کی عظمتوں میں پوشیدہ ہے۔ اگر مقدر میں ہو تو ان گمشدہ وادیوں میں آدمی ایک جھونپڑا ڈالے اور ہمیشہ کے لئے وہیں کا ہو کر رہ جائے۔ میں انہی خیالات میں ڈوبا تھا کہ تاج محمد لنگاہ کی کھنکار نے خیالوں کا سلسلہ توڑا۔ وہ گپ شپ لگانے کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جناب ناصر رضوی نے ہانگ کانگ سے ۱۲ ہزار روپے والی گھڑی خریدی ہے۔ ایک اور خاتون ایم این اے ہمارے ساتھ تھیں۔ ان کے متعلق بتایا کہ انہوں نے کئی درجن قیمتی دیگیں خریدی ہیں۔ واللہ عالم اس بات میں کتنی صداقت تھی۔ اب جہاز گلگت پر پہنچ چکا ہے۔ اپنے دیس کے دیکھے بھالے نقشے ہمارے سامنے ہیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جاتی ہیں، اپنا وطن کیسا ہی، بہر حال اپنا ہے اور اچھا لگتا ہے۔ یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہیں مرنا ہے۔ ان ہی پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں کو چمن زار بنانا ہے۔ یہیں اور اسی سماج کے قدیم رشتے بدلنا ہیں۔ یہیں اور انہی لوگوں میں تبدیلی کا پہیہ تیز گھمانا ہے۔ اسی حسین مٹی سے ایک دن، انقلاب کی خوشبو اُٹھے گی۔ یہیں رنگ برنگے پھول مہکیں گے۔ اسی دھرتی سے نئے نغمے ابھریں گے۔ نئے گیت، نئے ساز اور نئی لے ہو گی۔۔۔۔۔۔ یہ کوئی انوکھی، کوئی انہونی اور کوئی اجنبی بات نہیں۔ دنیا میں ایسے ہوتا چلا آیا ہے۔ راستے میں خواہ کتنے لٹیرے ہوں اور کتنے ہی خونی بھیڑیے ہوں۔ قافلوں کو بہر حال اپنی منزلوں پر پہنچنا ہے۔ مساوات اور انسانیت کی روشنی نے بہر حال پھیلنا ہے۔۔۔ یہ تاریخ

کا اٹل اصول ہے۔ اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ فرار کی کوئی راہ نہیں ۔۔۔۔۔ ہم اس وقت اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر ہیں ۔۔۔۔۔ جہاز سے اتر کر خیالات کی شمعیں ذہن میں لئے ۔۔۔ اپنی دھرتی پر دوبارہ قدم دھرتے ہیں۔

چین روس تضادات

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، چین روس اختلافات کا وسیع تر جائزہ اس کتاب کے دائرۂ بحث سے باہر ہے۔ تاہم ان اختلافات کا محض ایک سرسری سا جائزہ پیش خدمت ہے۔

چین، روس تضادات پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ دونوں جانب سے غزل اور جواب آں غزل کا زبردست سماں بندھا ہے۔ تحقیق و تنقید کے نشتر چلے ہیں۔ سٹالن کی وفات کے فوراً بعد ہی اس کش مکش کی ابتدا ہو گئی تھی۔ تاہم باہمی نوک جھونک کا سلسلہ ۱۹۶۲ تک درون خانہ چلتا رہا۔ اس کے بعد دونوں پارٹیوں میں تضادات کھل کر سامنے آ گئے۔

سٹالن کی وفات کے بعد روس میں اس کے خلاف زبردست ردعمل شروع ہوا۔ اسے فسطائی، ڈکٹیٹر، جابر جانے کیا کیا کہا گیا۔ تاہم چین والوں نے سٹالن کے بعض رویوں پر تنقید بھی کی مگر مجموعی طور پر سٹالین کو ہیرو کا درجہ دیا۔ کہا گیا اس کی غلطیاں ۳۰ فی صد ہیں مگر خدمات ۷۰ فی صد لہذا سٹالین پر بے رحمانہ تنقید روا نہیں۔ نظریاتی طور پر سٹالین کا مسئلہ دونوں پارٹیوں کے درمیان پہلا نزاعی مسئلہ تھا۔

سٹالین پر چین نے ہمدردانہ موقف کیوں لیا۔ اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں بالشویک پارٹی کی تاریخ سمجھنا پڑے گی۔ بالشویک درحقیقت صنعتی پرولتاریہ کی تحریک تھی۔ روس کی پرولتاریہ اس دور کے یورپ کی پرولتاریہ کی مانند انتہائی باشعور، منظم اور انقلابی نظریات سے مسلح تھی۔ اس پرولتاریہ کو بالشویکوں کی مؤثر سیاسی قیادت میسر تھی۔ چنانچہ جوں ہی پہلی جنگ عظیم کا عمل شروع ہوا۔ سامراجی باہم ٹکرائے۔ اس ٹکراؤ کی کیفیت نے روس کے جاگیرداروں،

سرمایہ دعل اور شاہ پرستوں کو کمزور اور تنہا کر دیا۔ بالفاظ دیگر یوں ہی سامراج کی گرفت رُوس پر کمزور ہوئی۔ اس تاریخی وقفے کے دوران لینن کی عظیم قیادت میں بالشویک آگے بڑھے۔ انھوں نے بحران کی مہلت سے پُورا پُورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ صنعتی پرولتاریہ کی مدد سے انقلاب برپا کر دیا گیا۔ اگر یہ قیمتی لمحہ ضائع کر دیا جاتا تو شاید روس ابھی تک باقی ماندہ یورپ کی مانند سرمایہ داری کے کولھو میں پس رہا ہوتا۔

تاہم روسی انقلاب میں کسانوں کا صرف اتنا حصہ تھا کہ سپاہی جنگ سے اُکتا چکا تھا۔ بالشویک انقلاب نے اسے بے سروسامانی کی موت مرنے سے بچا لیا تھا۔ چنانچہ اس نے جنگ یا صلح کے حوالے سے انقلاب کو دیکھا اور بالشویکوں کی مدد کی۔ مگر انقلاب کی قیادت کا سہرا لینن گراڈ کے مزدوروں کے سر تھا۔ کسانوں کا حصہ ناقابل ذکر ہے۔ یعنی مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بالشویکوں نے (اپنے مخصوص حالات کے حوالے سے) کسی حد تک کسانوں کو نظرانداز کیا۔ اور صنعتی پرولتاریہ کی حمایت سے اکتوبر کا انقلاب لائے۔ انقلاب کے بعد بھی کسانوں کا مسئلہ بالشویک قیادت کے لیے انتہائی اہم مسئلہ بنا رہا۔ غالباً معاہدہ بریسٹ کے بعد دُوسرا بڑا اور اہم مسئلہ۔ اس وقت تک کسانوں پے بائیں بازو کے انقلابی سوشلسٹوں اور منشویکوں کا قبضہ تھا۔ انقلاب کے تین سال بعد لینن نے "بائیں بازو کے انقلابی سوشلسٹوں کا کسان منشور" من وعن اپنا لیا۔ اس بات پر بھی سنٹرل کمیٹی نے تنقید کی۔ تاہم لینن کی اس دُور اندیشی نے منشویکوں وغیرہ کو کسانوں کی حمایت سے محروم کر دیا۔ کسان عوام بالشویک جماعت کے اردگرد جمع ہوئے تو صرف اس وقت خانہ جنگی پر قابو پایا جا سکا۔

لینن کی وفات کے بعد بالشویک قائدین کی اکثریت اس اُمید پر بیٹھی تھی کہ مغربی یورپ (خصوصاً جرمنی) میں انقلاب آئے گا۔ یعنی پرولتاریہ کا کلاسیکل انقلاب برپا ہو گا۔ مثلاً سنٹرل کمیٹی کے انتہائی اہم ممبران لیمنوف، بخارین کا وغیرہ کا یہی موقف تھا۔ ٹراٹسکی نے کہا تھا: "رُوسی انقلاب اس وقت تک کمزور اور ناقابل دفاع رہے گا۔ جب تک یورپ مثلاً جرمنی وغیرہ میں

انقلاب نہیں آجاتا "

یہ حیرت کی بات ہے کہ لینن کے بعد سٹالین وہ پہلا آدمی تھا جس نے کسانوں کے مسئلے کو پوری طرح سمجھا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ آئندہ انقلاب ہندوستان یا چین میں بھی آ سکتا ہے۔ ہر اُس ملک میں آ سکتا ہے جہاں سامراج کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ خواہ وہ ملک نوآبادی ہو یا سامراجی۔

جب چین میں جاپان کے تسلط کے خلاف جنگ شروع ہوئی تو روسی کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے اہم عہدیدار یہ فرض کرنے کو تیار نہ تھے کہ وہاں بھی انقلاب آ سکتا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ کائی شیک چین کا کمال اتاترک ثابت ہوگا۔ اور اس کی قیادت میں بورژوا انقلاب آئے گا۔ تاہم سٹالین کا تجزیہ مختلف تھا۔ وہ کسان عوام اور نوآبادیاتی ملک میں بھی انقلاب کی توقع رکھتا تھا۔ اس دور میں جب روسی کمیونسٹ پارٹی مغرب کی جانب کان لگائے بیٹھی تھی — سٹالین کی توجہ مشرق جانب تھی۔ ہو سکتا ہے اُسے لینن کی تحریروں کے ذریعے مشرق میں تبدیلی کا احساس ہوا ہو۔ چونکہ وہ خود کسان پس منظر سے اُبھرا تھا۔ اور ایشیائی تھا۔ لہٰذا مشرق کی بیداری کو سب سے پہلے اس نے محسوس کیا۔ چنانچہ اس کے دور میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی سرپرستی ہوتی رہی۔ اس کی وفات تک روس بھی ایک انتہائی ترقی یافتہ صنعتی ملک بن چکا تھا۔ سوشلسٹ معیشت نے روس کو تکنیکی، فنی اور مادی لحاظ سے عالمی قوت بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے ایک بڑے صنعتی یا سوشلسٹ نظام میں جنم لینے والی نئی بالشویک پود کسانوں کے انقلاب کا احاطہ کرنے سے فطری طور پر معذور تھی۔ چین کا انقلاب غلام ملک کے انتہائی پسماندہ کسانوں کا انقلاب تھا۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی (بالشویکوں کے برعکس) کسانوں پر مشتمل تھی۔ روس میں سامراجی جنگ کا مسئلہ تھا۔ چین کو جنگِ آزادی سے گزرنا پڑا۔ گویا چینی کمیونسٹ پارٹی کا تاریخی، سماجی اور نفسیاتی پس منظر، ۱۹۱۷ء کے بالشویکوں سے فطری طور پر مختلف تھا۔ کیونکہ ساری صورت حال مختلف تھی۔ سٹالین (چین والوں کے نزدیک) آخری بالشویک تھا جو مشرق کے مسائل سمجھتا تھا۔ چنانچہ چین کو سٹالین کو

انقلابی قرار دیا گیا۔ اسے کامریڈ کہہ کر پکارا گیا۔ کیوں کہ چینی انقلاب میں اس کا بھی حصہ تھا۔

دوسری اہم وجہ معاشی اور مادی تھی۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے سٹالین کے بعد کا روس خلا میں سپوتنک پھینکنے کا بانی تھا۔ صنعتی، اور فنی طور پر ترقی یافتہ تھا۔ لہذا چین کی دیو مالائی کسان معیشت کے تضادات (جو انقلاب کے بعد بھی موجود تھے) کو پوری طرح نہ سمجھا گیا۔ اس دونوں جماعتوں میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ ان اختلافات کا ذکر چینی کمونسٹ پارٹی (سنٹرل کمیٹی میں) ماؤزے تنگ کی تقریر سے بھی ملتا ہے۔ ماؤزے تنگ نے ۱۹۵۵ء میں اپنی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کو بتایا۔

"مادی اور تکنیکی ترقی نے روسی قیادت کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ کیا خاک کمونسٹ ہیں! کیا عجیب مارکسسٹ ہیں!"

تیسری اہم وجہ منچوریا کے کچھ حصے ہیں۔ یہ علاقے اس وقت روس میں شامل ہیں۔ چین والے کہتے ہیں کہ یہ علاقے چین کا حصہ ہیں لہذا چین کو واپس ملنا چاہئیں۔

چوتھا اختلاف شخصیت پرستی کے حوالے سے سامنے آیا۔ روس والوں نے اعتراض کیا کہ ماؤزے تنگ کی شخصیت کو دیو مالائی کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ جو کہ بنیادی طور پر مارکسزم کے خلاف ہے۔ اس قسم کی شخصیت پرستی سٹالین کا شیوہ تھی۔

پانچواں اختلاف طبقاتی کشمکش کے حوالے سے پیدا ہوا۔ روس والوں نے کہا۔ ان کی ریاست میں طبقات ختم ہو چکے ہیں۔ اب ریاست تمام عوام کی ملکیت کی ہے۔ چین نے اعتراض کیا "سوشلسٹ دور میں طبقات ختم نہیں ہو سکتے۔ جب طبقات ختم ہوں گے تو ریاستی ڈھانچہ ختم ہو جائے گا۔ اصل قوت سوویت یا کمیوں کے پاس آ جائے گی۔ چونکہ روس کا ریاستی ڈھانچہ موجود ہے۔ تنخواہوں میں ابھی فرق موجود ہے لہذا روس میں طبقات موجود ہیں۔

چھٹا اختلاف اس بات پر پیدا ہوا کہ آیا — موجودہ دور میں مسلح جدوجہد کے ذریعے انقلاب آئے گا یا پُر امن طریقے سے۔ چین نے مسلح جدوجہد کا نظریہ اپنایا یا خروشیف نے کہا مسلح جدوجہد

سے تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو سکتی ہے۔ چونکہ سوشلسٹ نظام معاشی لحاظ سے برتر ہے لہذا منطقی طور پر دُنیا اسے اپنانے پر مجبور ہوگی۔

ان باہمی اختلافات نے دنیا بھر کی سوشلسٹ پارٹیوں کو متاثر کیا۔ سوشلسٹ کیمپ دو حصوں میں بٹ گیا۔ باہمی مباحثوں، مناظروں اور مجادلے سے ایک طوفان آگیا۔ چین نے 'خود انحصاری' کا تصور پیش کیا۔ اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی۔ یہ کہا گیا کہ ہر ملک کے عوام کا فرض ہے کہ وہ کسی اور جانب دیکھے بغیر باہر سے مدد کی توقع کے بغیر اپنے اپنے ملک میں انقلابی جدوجہد کریں ____'

چونکہ چین اقوام متحدہ کا ممبر نہ تھا۔ لہذا اس دور میں چینی پارٹی نے اقوام متحدہ پر خوب چڑھائی کیے رکھی۔ یہ کہا گیا کہ اقوام متحدہ سامراج کا لگژری کوچ ہے۔ جہاں بیٹھ کر سامراجی دُنیا کو بانٹنا چاہتے ہیں۔ رُوس کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی اور اسے سوشل سامراج کا نام دیا گیا۔

چین رُوس باہمی کش مکش کی خواہ کیسی ہی ٹھوس نظریاتی وجوہات کیوں نہ ہُوئی ہوں۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس کش مکش نے چین کی خارجہ پالیسی کو خاصا نقصان پہنچایا۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ روس کو دشمن نمبر ایک قرار دے دیا گیا۔ (جو کسی طور صحیح نہیں ہے) روس کو انحراف پسندی کا الزام دیا جا سکتا ہے۔ جب تک قومی ریاست کی حدود موجود ہیں۔ مارکسزم سے کسی نہ کسی نکتے پر انحراف کا امکان موجود رہتا ہے۔ خواہ چین ہو یا روس، دونوں ہی کو بعض اوقات انحراف کرنا پڑتا ہے۔ قومی ریاست کے شدید دباؤ اور تقاضوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ ہم جس دُنیا میں بستے ہیں اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ لہذا روس پر نظریاتی تنقید کی گنجائش بھی اور اس کے انحراف کے پس منظر کو سمجھا بھی جا سکتا ہے۔ تاہم روس کو دُنیا کے عوام کا دشمن نمبر ایک قرار دینا جائز نہیں۔

مگر چونکہ چین نے رُوس کو دشمن نمبر ایک قرار دے دیا۔ لہذا عالمی سطح پر ہر اس پالیسی کی

مخالفت کی گئی جسے روس نے اپنایا۔ چنانچہ انگولا میں اس پالیسی کے تحت رجعت پسندوں کی امداد کی گئی۔ چلی میں آیاندے کے قاتل فوجی ٹولے کی حمایت کی گئی۔ چونکہ بنیادی مفروضہ غلط ہو گیا ہے۔ لہٰذا خارجہ سطح پر مسلسل غلط نتائج برآمد ہوتے رہیں گے۔

”خود انحصاری“ کا نظریہ بہت کارآمد ہے۔ مگر صرف ”خود انحصاری“ کے حوالے سے کسی ملک کے عوام انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ بنیادی طور پر یہ ہر ملک کے عوام ہی کا فرض ہے کہ وہ انقلاب کے لیے جدوجہد کریں۔ تاہم یہ آخری بات بھی نہیں۔ انقلاب کا بین الاقوامی پہلو بھی ہے۔ ہر انقلاب، عالمی انقلاب کی کڑی ہے تو پھر ہر سوشلسٹ ملک پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمی انقلاب کے تسلسل کو تیز تر کرنے کے لیے مصروفِ جہد اقوام، ممالک، اور عوام کی اخلاقی، مالی اور نظریاتی امداد کرے۔ بین الاقوامیت مارکسزم کا بنیادی اصول ہے۔

عملاً بھی ”خود انحصاری“ ناممکن تصور ہے (بالخصوص عالمی انقلاب کے حوالے سے) مثلاً چین نے کوریا کی جنگ میں رضاکار فوج بھیج کر وہاں کا سوشلسٹ انقلاب بچایا۔ ویت نام، لاؤس اور کمبوڈیا کی دامے درمے سخنے امداد کی۔ یہ چین کا بین الاقوامی فرض تھا۔ جو اس نے ادا کیا۔ مگر محض روسی پالیسی کی مخالفت میں جہاں جہاں رجعت پسندوں کی حمایت کی گئی ہے وہاں چین کی خارجہ پالیسی نے انحراف کی ٹھوکر کھائی ہے۔

آج کا دور سامراج اور نیم نوآبادیات کا دور ہے۔ چنانچہ ہر ملک کے عوام عالمی سامراج کے شکنجے میں بے بس ہیں۔ جب وہ اپنے ملک میں جدوجہد شروع کرتے ہیں تو سامراج وہاں کی رجعت پسند قوتوں کی امداد کے لیے آن پہنچتا ہے۔ مارشل لاء — یا ایسی ہی کوئی وحشیانہ آمریت ان پر مسلط کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ، مقابلہ عوام اور سرمایہ دار یا جاگیردار طبقوں کے درمیان نہیں رہتا۔ بلکہ اصل مقابلہ سامراج اور نہتے عوام کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں نہتے عوام کو سامراج کا نوالہ بننے دینا — یا پھر ان کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرنا صریحاً انحراف ہے۔ خواہ روس ہو یا چین، یا کوئی اور سوشلسٹ ملک، انھیں عالمی سامراج کے خلاف —

عالمی انقلاب کی حمایت کے حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔ کیونکہ ہر سوشلسٹ ملک کے دو نظریاتی پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اندرونی اور دوسرا عالمی۔ ان دونوں پہلوؤں میں تطابقت بہت لازم ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی تعبیر کے بغیر تکمیلِ انقلاب ممکن نہیں۔ مختصراً یہ کہ عالمی سامراج کے ڈنگل میں بے یار و مددگار عوام کو محض "خود انحصاری" کے نظریے کے حوالے کر دینا کسی طور عالمی انقلاب کے حق میں مفید نہیں۔ بعد از انقلاب "خود انحصاری" دو علیحدہ صورتیں ہیں۔ لہٰذا ان میں فرق لازم ہے۔

چین روس تضادات سے جہاں انقلابی تحریکوں کو شدید نقصان پہنچا ہے وہاں امریکی سامراج کو وقتی فائدے اور کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں امریکہ آج تک صرف اس لیے موجود ہے کہ وہ ان تضادات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ انھیں رجعت پسندوں کے حق استعمال کرتا ہے۔ سامراج ان تضادات کی آڑ میں تیسری دُنیا کی گردن پر ہنوز پنجے گاڑھے ہوئے ہے۔

تاہم مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تضادات فی الحقیقت ایک صنعتی اور تکنیکی سوشلسٹ معیشت (یعنی روس) اور ایک نیم زرعی اور نیم صنعتی سوشلسٹ معیشت (یعنی چین) کے درمیان اُبھرنے والے تضادات ہیں۔ چین کا کمیون زرعی یونٹ سے صنعتی یونٹ میں بدل رہا ہے۔ لہذا چین انتہائی تیزی سے صنعت اور ٹکنالوجی کے دَور میں داخل ہو رہا ہے۔ معیشت کی کروٹ، اور باہمی کش مکش کے تجربی نتائج کے باعث دونوں ممالک کی پارٹیوں کے باہمی تضادات میں کمی واقع ہو جائے گی۔ منطقی طور پر آنے والے دَور میں یہ اختلافات بڑھنے کی بجائے کم ہوں گے ؎

بین الاقوامی تعلقات کی دُنیا میں چین رُوس کش مکش سے جو بھونچال آیا ہُوا ہے وہ بھی ان دُونوں سوشلسٹ ممالک کو بہرحال اس اٹل نتیجے پر پہنچائے گا کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو کم کریں۔ لہذا سامراج کو' ان دونوں ممالک کے اختلاف کے باعث جو فرصت

JALALI BOOKS

میں آئی ہوئی ہے۔ اور جس بے خوفی سے وہ تیسری دُنیا کو روند رہا ہے۔ اس پر بھی جبھی بند لگ سکے گا۔ چھوٹے، کمزور مگر سامراجی نظام سے بیزار ممالک تیزی کے ساتھ شاہراہ انقلاب پر گام زن ہو سکیں گے۔

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

ہالہ کے اُس پار

ہمارے ہاں سفرنامے پہلے بہت کم لکھے جاتے تھے، شاید اس لئے کہ جو سفر کر سکتے تھے ان میں بیشتر کے پاس قلم نہیں تھا اور جن کے پاس قلم تھا وہ خال خال ہی سفر کر سکتے تھے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ قلم کو سفر کے کافی مواقع میسر آ رہے ہیں جن کی گواہی بے شمار سفرنامے دیتے ہیں۔ میں نے آج تک جتنے بھی سفرنامے پڑھے ان میں بیشتر تجربے اسلوب اور معلومات کے حوالے سے مجھے پسند آئے لیکن ان میں کسی میں بھی سیاح کا نظریۂ حیات یا زاویۂ نظر، نظر نہیں آیا یا کم از کم واضح نہیں۔ راجہ کا یہ سفرنامہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ محض فوٹوگرافی نہیں بلکہ اس سفرنامے میں اُن کے تمام نظریات دھڑکتے ہیں جن کے حوالے سے انہوں نے چین اور کوریا کا سفر کیا۔

انور سجاد

KUTUB
JALALI BOOKS
JALALI

راجہ انور

کی دُوسری تصانیف

- چھوٹی جیل سے بڑی جیل تک
- جھُوٹے رُوپ کے درشن
- مارکسی اخلاقیات

نئے ایڈیشن زیرِ اشاعت

کلاسیک (چوک ریگل)، مال، لاہور